مطبوعات جدیدہ

الدین القیم مصنفہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ) ضخامت چھوٹی تقطیع پر ۳۲۰ صفحے، قیمت عام ، پتہ :- دفتر الفرقان بریلی،

اس کتاب کی نسبت اختصار کے ساتھ یہ کہنا کافی ہے کہ مصنف نے اس مین صوفیانہ علم کلام کو پیش کیا ہے، اصل مین مولانا نے جامعہ عثمانیہ کے طالب علمون کے سامنے اس کو بطور املا اور درس کے بیان کیا تھا، اوس کو بعض طالب علمون نے قلم بند کر لیا تھا، اب مولانا نے اسی تحریر کو افادۂ عام کی غرض سے اصلاح و ترمیم کے بعد ایک کتاب کی صورت مین مرتب کر دیا ہے، کتاب دو معنوی حصون پر منقسم ہی پہلے حصہ مین اہل عقل و فلسفہ نے معمائے کائنات کے حل مین اپنے عجز کا جو اعتراف کیا ہے، اس کا بیان ہی اور دوسرے حصہ مین وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود یا عقیدۂ قیومیت باری تعالیٰ کے ذریعہ سے اس معمہ کو حل فرمایا ہے، اور اسی کی راہ سے ذات و صفات و رسالت و نبوت و معجزات و خوارق مسئلہ خیر و شر و قضا و قدر و جبر و اختیار و تکلیفات شرعیہ و جزاء و سزا و مسئلہ شفاعت و نجات وغیرہ پورے علم کلام اور حقیقت زمانہ وغیرہ فلسفیانہ مسائل کو اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہی، طرز ادا دلپذیر و موثر، سہل و روان، توضیح مسائل مین ظاہر شرع کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے، صرف دو باتون مین ہم ظاہر بین کو تھوڑی کھٹک ہوئی، صوفیانہ العام یا نظریۂ تخلیق کنت کنزاً مخفیاً کو ان کا حدیث کہنا اور ولا الضالین کی ذوقی تفسیر جو نصوص کے خلاف ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے قلم کی شادابی و تازگی کو اور بڑھائے کہ وہ دلون کو ترو تازہ بناتا ہی، "س"

یورپ جنگ سے پہلے از جناب ہارون خان صاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ، ناشر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن، حجم ۱۷۰ صفحے، قیمت ، پتہ :-

مصنف نے ۱۹۳۸ء مین بین الاقوامی تاریخی کانگریس کے اجلاس سوئزرلینڈ مین شرکت کی تھی، اس سلسلہ مین انھون نے چار مہینے یورپ کے مختلف ملکون مین بسر کئے، اب اس سفر کا روزنامچہ عنوان بالا سے کتابی شکل مین شائع ہوا ہی جس مین یورپ کے مختلف مشہور ملکون کے طرز زندگی وہان کے مختلف احوال اور ذاتی تاثرات پیش کئے گئے ہین، نیز مختلف ملکون کے تاریخی آثار کے تاریخی معلومات اعتدال کے ساتھ لکھے گئے ہین، آخر مین بین الاقوامی کانگریس کے اجلاس کی مفصل کارروائی اور ان خدمات کا ذکر آیا ہی، جو مصنف کے ہاتھون تاریخ ہند کے متعلق اس اجلاس مین انجام پائے ہین، نیز یورپ کے کتب خانون کی سیر کے سلسلہ مین عربی و فارسی کی بعض نادر تاریخی کتابون اور بعض دیگر نوادر کے دیکھنے کا تذکرہ کیا ہی، مجموعی حیثیت سے یورپ کے مشہور ملکون کے حالات اور ان کے نوادر پر یہ پُر معلومات رسالہ ہی، امید ہی کہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا،

شمع فروزان مترجمہ جناب صادق الخیری ایم اے، ناشر خاتون کتاب گھر، اردو بازار، دہلی، حجم ۱۰۳ صفحے، قیمت :- ۱۲

شمع فروزان امریکہ کی نوبل پرائز پانے والی شہرۂ آفاق مشرق نواز مصنفہ پرل بک کے ایک مختصر ناول کا کامیاب اردو ترجمہ ہی اس کی مشہور تصنیف گڈ ارتھ کا ترجمہ اس سے پہلے اردو مین منتقل ہو چکا ہی، یہ مختصر ناول بھی اسی انداز مین ترتیب پایا ہی جس مین ایک طرف ایک نوجوان چینی نوجوان کا کردار دکھایا گیا ہی، اور دوسری طرف ایک چینی گھرانے کے مشرقی طرز زندگی اور اس خاندان کی ایک تربیت یافتہ خاتون کے شریفانہ جذبات اور ایثار و قربانی کی موثر داستان الم انگیز انداز مین بیان کی گئی ہے، ترجمہ کی زبان صاف ستھری اور بیساختہ ہی، "سا"

جلد ۵۴ ماہ ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۴ء عدد ۵

مضامین

شذرات

علمائے ندوہ کی برادری مین یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ان کے سب سے پرانے رفیق اور دوست مولانا حافظ فضل رحمان صاحب ندوی امام و خطیب جامع مسجد خانقاہ مجددیہ سرہند نے چند ماہ کی علالت کے بعد بمرض استسقاء بمقام مدرسۂ فرقانیہ لکھنؤ بتاریخ ۲۰ راکتوبر ۱۹۴۴ء بروز جمعہ، بجکر ۳۰ منٹ شام کے وقت اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، ان کی عمر غالباً ۶۵ برس کے اندر ہوگی، کیرانہ ضلع مظفر نگر ان کا اصلی وطن تھا، مگر بچپن سے وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوہ مین داخل ہو کر متوسطات تک کی تعلیم پائی، اور فکر معاش سے مجبور ہو کر مدرسہ ہی مین صرف و نحو کی مدرسی کی خدمت قبول کر لی، وہ استاذنا جناب مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی مدرس اعلیٰ دار العلوم کے محبوب شاگردون مین تھے، صرف و نحو اور ریاضیات سے بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے، انتظامی سلیقہ بھی اچھا تھا، جن لوگون کو مولانا شبلی مرحوم کے زمانہ کے ندوہ اور الندوہ سے تعلق رہا ہی ان کو مکتبۃ المعین کی بھی یاد ہوگی، مرحوم اس مکتبہ کے مہتمم اول تھے، لکھنؤ مین عربی کی مصری مطبوعات کی تجارت کا آغاز انھی نے کیا، اور اب موجودہ شبلی بک ڈپو اسی کی یادگار ہے،

مرحوم نے عین جوانی مین انابت الی اللہ کی توفیق پائی، اور مدرسہ کی نوکری چھوڑ کر مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنؤی رحمۃ اللہ علیہ

سے نقشبندی مجددی طریقہ میں بیعت کی اور انہی کے مدرسۂ فرقانیہ میں مدرس بھی ہوگئے، اور پھر انہی کے ہو رہے، انہی کے زمانہ میں حج سے بھی فراغت پائی، ان کی وفات کے بعد لکھنؤ سے سرہند جاکر خانقاہ مجددیہ کی جامع مسجد میں خطابت و امامت قبول کی، آخر میں اس کا معاوضہ چھوڑ کر حسبۃً للہ اس کام کو انجام دیتے رہے، اور متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اس سلسلہ کے سارے متوسلین جو افغانستان سے گجرات تک پھیلے ہیں ان سے بھی طرح واقف تھے اور مدارح تھے، قناعت پسند زہد پیشہ، پھر بذلہ سنج، ہمیشہ بہار اور شادان و فرحان رہتے تھے، دوستوں کی دوستی میں بیدار اور مخلص تھے، قیام ندوہ کے زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے اکثر حسابات کی رقمیں انہی کے پاس رہتی تھیں اور اسی سلسلہ سے مکاتیب میں کہیں کہیں ان کا نام بھی

مرحوم نے اپنے دو بچوں میں سے بڑے کو جن کا نام مولوی محبوب الرحمٰن ہے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں دلا کر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھیجا، یہاں وہ کئی سال تک علوم درسی سے فراغت پا کر مزید تکمیل کی غرض سے جامع ازہر مصر چلے گئے، وہاں دو سال رہکر قدیم و جدید علوم فلسفہ و تاریخ و ادب وغیرہ کی تعلیم پائی اور دو سال ہوئے کہ شام و عراق ہو کر ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو صبر و ثبات عطا فرمائے، اور اپنے باپ کا حقیقی جانشین بنائے۔

بحمد اللہ کہ **دار العلوم** ندوۃ العلماء نے اس موجودہ گرانی کے عالم میں سرکار نظام خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ امداد سے نئی زندگی پائی، اب حضرات مدرسین مطمئن ہو کر اپنے فرائض میں بجمعیت خاطر مصروف و مشغول ہیں طلبہ کی تعداد بھی گذشتہ سال سے دونی ہوگئی ہے امسال کام کرنے والوں میں بھی بفضلہ تعالیٰ کام کا نیا ولولہ پیدا ہے، اگر جنگ کا زمانہ نہ ہوتا، تو بہت سی نئی ترقیاں ظہور میں آتیں مگر اس وقت بھی غنیمت ہے کہ مدرسہ جادۂ حیات پر مستقیم ہے،

البتہ غیر مستطیع طلبہ کے وظائف کی مد میں اشیائے خوراک کی گرانی کے سبب سے بیحد کمی ہے، ضرورت ہے کہ اہل دل دردمند جو علوم دینی کی تعلیم و اشاعت کی ضرورت کو سمجھتے اور اسکی امداد میں حصہ لینے کو کار ثواب جانتے ہیں ادھر توجہ فرمائیں، اور ناظم صاحب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام سے اپنی امداد بھیجیں،

افسوس یہ ہے کہ عربی تعلیم ہمارے دولتمند اور شرفا کے گھرانوں سے عام طور سے رخصت ہو رہی ہے، اب جو کچھ اس کا رواج و قیام ہے وہ صرف غربا کے ذریعہ ہے، اب اگر دولتمند طبقہ اپنے جگر گوشوں کی قربانی نہیں کر سکتا، تو اس تعلیم کی بقا کیلئے چند خزف ریزوں کی قربانی تو گوارا کرے ورنہ خدا دل میں سوچنا چاہئے کہ جو جان سے مدد نہیں کر رہے ہیں اگر وہ مال سے بھی مدد نہ کریں تو وہ دین کی اشاعت و تبلیغ کے مواخذہ سے قیامت کے دن کیونکر بچینگے،

لکھنؤ میں چند دردمند مسلمانوں نے مل کر ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا ہے، خوشی ہے کہ اسکی تعلیمی و علمی خدمت کی سربراہی کی توفیق بعض علمائے ندوہ کو حاصل ہوئی ہے اور بعض دیندار تعلیم یافتہ حضرات اسکی مالی امداد میں حصے رہے ہیں، ادارہ کا مقصد بانغ کاروباری اور نوکری پیشہ لوگوں میں قرآن پاک کی تعلیم کی اشاعت ہے، وہ آسان اور سہل طریقوں سے ابتدائی عربی زبان سکھا کر ساتھ ہی روزانہ اسباق کے ذریعہ سے قرآن پاک کی عربی عبارت پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد پیدا کرتے ہیں، اور ہفتہ میں ایک دن اسی طرح حدیث کی تعلیم ہوتی ہے، ادارۂ مذکور کی طرف سے ادارہ کے استاذ مولینا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے اپنے طریقۂ تعلیم پر دو رسالے بھی شائع کئے ہیں جن سے ان کے خیال اور تجربہ کے مطابق آسانی سے عربی زبان عموماً اور قرآن کی عربی خصوصاً سیکھی جا سکتی ہے، اور باہر کے لوگ خط و کتابت کے ذریعہ سے بھی اس طریقہ کی تعلیم مفت حاصل کر سکتے ہیں خط و کتابت کا پتہ یہ ہے: ادارۂ تعلیمات اسلام نمبر ۳، امین آباد لکھنؤ،

مقالات

اقبال۔ انا اور تخلیق

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ام اے، لکچرر فلسفہ، گورنمنٹ کالج، لاہور،

"دسمبر ۱۹۴۲ء میں لاہور میں کل ہند فلاسفی کانگریس کا اٹھارہواں اجلاس منعقد ہوا، اس کے کھلے اجلاس میں راقم الحروف کا ایک انگریزی لکچر اقبال کا نظریۂ انا اور تخلیق کے موضوع پر ہوا، اس لکچر کا ملخص رسالہ وشوبھارتی شانتی نکیتن کے فروری اپریل ۱۹۴۳ء نمبر میں چھپ چکا ہے، مقالۂ ذیل میں اس موضوع پر ذرا زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔"

اقبال کے نظریۂ خودی یا انا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن اُس کے اس نظریے کی طرف کہ بشری انا ایک ایسا فاعل ہے، جو اپنے اندر تخلیق و تجدید کی استعداد رکھتا ہے، بہت کم توجہ دی گئی ہے، حالانکہ انا کا تخلیقی پہلو فلسفۂ خودی کے لئے مرکزی اور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ سطور ذیل میں فلسفۂ اقبال کے اس پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کیلئے ضروری ہے، کہ اقبال کے نظریۂ عالم اور نظریۂ خودی کے اہم حصوں کو ذہن نشین کر لیا جائے، اقبال کا عقیدہ ہے کہ عالم موجودات کوئی بنی بنائی شے نہیں ہے، جو کسی قسم کے تغیر و تبدل کے بغیر باقی و قائم ہے، کائنات کی شکل ایک ایسی روکی ہے جو ہر وقت متحرک ہے، اس کا ہر لمحہ دوسرے لمحوں سے مختلف ہے، اور اسکی کوئی ایک حالت دوسری حالتوں سے یکساں نہیں ہے،

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے، زمانے میں

سکون، جمود اور خمود، یہ سلبی کیفیتیں ہیں، کائنات کی یہ ایجابی اور مثبت حالتیں نہیں ہیں، یہ حالتیں تو کسی نقص کو ظاہر کرتی ہیں، خواہ یہ نقص عالم موجودات کے شعبے میں ہو، یا خود ہمارے اپنے مشاہدے میں ہو، جو اس شعبہ کے تغیرات کا جائزہ لیتے وقت اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے، کائنات کا یہ کارخانہ زندگی کی طرح ہمیشہ دواں اور ہر دم رواں ہے، سکون یا تو موت کی علامت ہے، یا موت کا پیش خیمہ ہے، اور خود موت بھی جو کسی ایک کو ختم کرتی ہے کئی دوسرے ایکوں کو زندگی بخشتی ہے، کائنات بحیثیت کل بھی متحرک ہے، اور اپنے اجزا کی حیثیت سے بھی متحرک ہے، وہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے، بدلتی ہے، اور اس کے کسی ایک لمحے کی کیفیات کا مکمل جائزہ ہمیں اس کے آیندہ لمحوں کی کیفیات کی فراوانی کا صحیح اور مکمل اندازہ نہیں دے سکتا، گندم کے ایک دانے سے ہم بیسیوں اور دانے حاصل کرتے ہیں، ایک بیج سے عالیشان درخت پیدا ہوتا ہے، جو سیکڑوں ہزاروں بیج دیتا ہے، ایک بچے کی پیدائش ایک پوری نسل کی پیدائش ہوتی ہے، ایک نیکی سے کئی دل شاداب ہوتے ہیں، اور کئی نیکیاں پیدا ہوتی ہیں، مختصر یہ کہ ایک سے کئی ایک نکلتے ہیں، کائنات کے ہر ذرہ

سے صدائے کن فیکون نکل رہی ہے، یہ چند مثالیں دلیل ہیں اس امر کی کہ عالم موجودات کوئی بنی بنائی جامد اور اٹل غیر متغیر اور مستقل شے نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا نظام ہے، جو اپنی گود میں ان گنت اور نت نئے حقائق، کیفیات، واقعات اور تغیرات لئے ہوئے ہے، اسی لئے اقبال کہتا ہے کہ کائنات کی ہر وہ تخمین و تعیین اضافی، سطحی اور غلط ہوگی، جو امروز و فردا، زمان و مکان، ماہ و سال کے خارجی پیمانوں سے ہوگی، اور ان پیمانوں کی تصوراتی زبان میں ہوگی، صحیح تخمین صرف ان واقعات، تغیرات اور کیفیات کی زبان میں ہو سکتی ہے، جو کسی خاص لمحہ میں کسی خاص انا پر گذرتی ہیں،

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گران ہے زندگی

قدیم یونان میں ہرقلاطیس نے یہ نظریہ اوّل اوّل پیش کیا تھا، کہ کائنات میں سکون محال ہے، ہر شے ہر وقت تغیر پذیر ہے، اور ہر طرف حرکت ہی حرکت ہے، اس نظریہ کو اوس نے اپنے مشہور مقولے میں یوں ادا کیا ہے، ہر شے بدل رہی ہے، صرف یہ قانون نہیں بدلتا، کہ ہر شے بدل رہی ہے، اقبال کا مشہور شعر ع

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ہرقلاطیس کے اس مقولہ کا گویا ترجمہ ہے، اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال لاحق ہوگا، کہ اقبال اس قدیم یونانی حکیم کا فلسفہ تغیر ہی ہمیں سنا رہا ہے، یہ خیال غلط ہے، ہرقلاطیس اور اقبال میں یہ اصولی اور اساسی موافقت ضرور ہے، کہ تغیر اصلی، اوّلی اور مثبت حالت ہے، اور سکون ضمنی، ثانوی اور سلبی کیفیت ہے، لیکن اس کے بعد ان دونوں میں تضادِ مطلق ہے، اور یہ تضاد بھی اصولی اور اساسی ہے، ہرقلاطیس کے مطابق تغیرات کا لامتناہی اور غیر منقطع سلسلہ جو کائنات کہلاتا ہے، بالکل اس دھارے کی طرح ہے، جو کسی مقصد کے بغیر وادی و کوہ کے نشیب و فراز، زمین کی نرمی اور سختی، اور اپنی تندی اور ضخامت سے مجبور ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اس کی رفتار اور اس کی ہر کیفیت و حالت چند ایسے میکانکی اصولوں کے مطابق ہے جنھیں کم و بیش غور کے بعد انسان سمجھ سکتا ہے، اور اگر ہم اُن تمام کوائف اور شرائط کو صحیح صحیح سمجھ لیں جو اس دھارے کی روانی کے لئے علت کا کام کرتی ہیں، تو ہم کہہ سکیں گے، کہ فلاں وقت یہ دھارا فلاں علاقہ میں ہوگا، اور اس اس حالت میں بہتا نظر آئے گا، ہرقلاطیسی تغیر کا یہ میکانکی نقطۂ نظر علمائے مغرب میں بہت مقبول ہوا، چنانچہ علوم طبیعیات ایسے ہی اصولوں کے مطابق اپنے اپنے شعبوں میں عالم موجودات کے مختلف مظاہر کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں، اور ہمیں ماننا پڑیگا کہ ان علوم کو اس کام میں بیشمار کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں لیکن پچھلے چند سالوں سے ماہرین طبیعیات کے دلوں میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں کہ یہ میکانکی اصول عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے اور جوں جوں علمی تحقیق حقائق کے نئے باب کھولتی جاتی ہے، اصولوں کی بے مائگی اور زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے،

اقبال کو تحقیق جدید کے ان نتائج نے بہت متاثر کیا تھا، چنانچہ وہ اپنے نظریۂ تغیر کو میکانکی تعصب سے بالکل پاک رکھتے ہیں، اقبال کا عقیدہ ہے (اور قرآن کے مطالعہ نے ان کے اس عقیدہ کو پختہ تر اور شکوک سے بالاتر کر دیا تھا) کہ کائناتی تغیر اندھا دھند اور بے مقصد نہیں ہے، مقاصد اس کے اندر جاری و ساری ہیں، اور یہ مقاصد ہیں مختلف ذی حیات اور ذی فہم ہستیوں کے، مختلف اشخاص کے اور مختلف اناؤں کے، جو غیر شعوری اور شعوری دونوں طرح سے ان کے حصول کے لئے مصروف عمل و پیکار رہیں، تغیرات کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو کائنات کہلاتا ہے، اپنی ہست و بود کے لئے مرہون منت ہے ان بے شمار چھوٹے بڑے اناؤں کا جو ایک انائے کبیر و عظیم کے تخلیقی کن سے حیات پاتے ہیں، اور پھر ادنیٰ پیمانہ پر اسی انائے کبیر کے تخلیقی کام میں شریک ہوتے ہیں، جس طرح انائے کبیر کا تخلیقی کن، ہر لمحہ مصروف عمل ہے،

اُسی طرح مخلوق انا اپنے اپنے کم و بیش محدود مقاصد کے حصول کے لئے مصروف پیکار رہتے ہیں، ع

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں

جو انا جامد اور ساکن ہوگیا، وہ گویا انا کے درجہ سے گر گیا، مخلوق اناؤں کے مقاصد محدود اور غیر مطلق ہوتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اور کسی طرح ان سب پر حاوی ایک مقصد مطلق بھی ہے، جو انائے کبیر کے ارادے سے اس نظام کائنات میں جاری و ساری ہے، انائے کبیر اس پورے نظام کی زندگی کا سرچشمہ ہے، اسی سے یہ نظام اپنی قوت و حرکت حاصل کرتا ہے، اور یہی انا ہر لمحہ اس نظام کا حافظ، رہنما، معین اور منبع فیض ہے، وہ زندہ ہے (کارخانۂ عالم کو) قائم رکھنے والا ہے، نہ اسکو اونگھ آتی ہے، نہ نیند، اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے ..... اور اُن کی حفاظت اس کو تھکاتی نہیں، اور وہ عالی شان اور عظمت والا ہے، (قرآن مجید)

ہر انا ایک فرد ہے، اور یہ فرد تجربے اور مشاہدے کا ایک محدود مرکز ہے، اس زندہ نقطہ کے گرد تجربے اور مشاہدے کے حاصلات جمع ہوتے رہتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے، کہ یہ فرد انا اپنے ماحول سے تعامل کر کے تجربے اور مشاہدے کے حاصلات کو اس طرح اپنے اندر جذب کرتا ہے، کہ وہ خود اس کی خودی کا جزو بن جاتے ہیں، اور اوس کی بالیدگی میں ممد ہوتے ہیں، ہر ایسا فرد انا کائنات میں اساسی اہمیت رکھتا ہے، اس کی حیثیت ایک ایسے زندہ واحدے کی سی ہے جو نظام عالم میں ایک کم و بیش حر کی مرکز کا کام دیتا ہے، اقبال کے نزدیک اگر فرد انا کی اس مرکزی حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے، تو نظام کائنات کی ایسی نظری توجیہ ناممکن ہو جاتی ہے، جو نہ صرف طبیعیات جدید کے انکشافات کی صحیح تشریح و تاویل کر سکے، بلکہ قرآن حکیم کے الہیات کے عین مطابق بھی ہو، اقبال کا فلسفۂ خودی اس اساس پر قائم ہے،

جب یہ فرد انا اپنے ماحول سے کامیاب تعامل کر کے ارتقا کے اعلیٰ درجوں تک پہنچ جاتا ہے، تو وہ خودی حاصل کر لیتا ہے، انا کی اس انفرادیت پر اقبال نے بہت زور دیا ہے، فرماتے ہیں، کہ زندگی جہاں بھی ہے، فرد کی صورت میں ہے، کلی زندگی یا زندگی بحیثیت کل کوئی شے نہیں ہے، خدا بھی ایک فرد ہے، یعنی وہ فرد جو بالکل بے مثل و بے ہمتا ہے"،

کائنات کا نظام کیا ہے؟ ان گنت افراد کا وہ نظام جس کا حاکم اعلیٰ اور منبع فیض وہ فرد بے ہمتا و کبیر ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں،

یہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے، ہم نے اوپر دیکھا ہے، کہ ہرقلاطیس اور اقبال میں اس امر میں مماثلت ہے کہ دونوں تغیر کو کائنات میں اساسی اہمیت دیتے ہیں، لیکن اس مماثلت کو چھوڑ کر ان میں قطعی تضاد ہے، کیونکہ ایک کے نزدیک یہ عالم کائنات بالکل بے مقصد و غایت ہے، اور محض میکانکی انداز سے چل رہا ہے، اور دوسرے کے مطابق یہی عالم مقاصد کی آماجگاہ ہے، اور اس میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی مقصد کے ماتحت ہو رہا ہے، خواہ یہ مقصد انائے کبیر کے ارادے سے متعلق ہو یا کسی انائے صغیر کے شعوری یا نیم شعوری ارادے سے جاری ہو، اس طرح اقبال کا نظریۂ فرد انا، جرمن مفکر لائبنٹز کے نظریۂ جوہر واحد (موناڈ) سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس مماثلت کے ساتھ ساتھ ان دونوں نظریوں میں اہم فرق بھی ہے، لائبنٹز کے مطابق عالم موجودات لاتعداد موناڈوں سے بنا ہے، ہر موناڈ ایک جوہر واحد ہے جو بسیط ہے، ناقابل تحلیل ہے، وسعت سے مبرا ہے، اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے، کائنات کا ایک اساسی واحدہ ہے، اور قوت و حرکت کا ایسا مرکز ہے، جو انا سے مشابہ ہے لیکن ان بے شمار موناڈی واحدوں میں کسی قسم کا تعامل نہیں ہے، البتہ سب تابع ہیں اس کبیر موناڈ کے جسے خدا کہتے ہیں،

خدا نے نظام کائنات چلاتے وقت ہر ایک موناڈ کو کچھ ایسے حُسن ترتیب سے چھوڑا کہ سب ہم آہنگ ہو کر اس کے ازلی و ابدی مقصد کے مطابق اپنا اپنا کام کر رہے ہیں،

اب اقبال کا فرد انا لائبنیز کے موناڈ سے چند نہایت اہم باتوں میں مختلف ہے، جہاں موناڈ محض حال مست، اپنی ذات میں مستغرق، قلعہ بند، اور دوسرے موناڈوں سے اس قدر ناآشنا ہے کہ کسی قسم کے لین دین کی گنجائش نہیں ہے، اقبال کا فرد انا، دوسرے ایسے افراد سے ہر وقت مصروف تعامل ہے، (اس امر میں اقبال انگریزی مفکر وارڈ کے بہت قریب ہے جو اس کی طالب علمی کے زمانہ میں انگلستان کے چوٹی کے مفکرین میں تھا) اب جہاں تعامل اور لین دین ہوگا، وہاں ایک کا اثر دوسرے پر پڑے گا اور ہر ایک ایسے واحدے کا حساب دوسرے کے لئے کھلا ہوگا، اس کے برعکس ہر موناڈ ایک بند اور محدود نظام ہے، جس کی حیثیت کائنات میں ایسی ہوگی، جیسی ان مختلف ذروں کی ہوتی ہے، جن سے مثلاً ایک اینٹ بنی ہے، لیکن اقبال کا فرد انا اپنے تعامل میں اپنے سے کم رتبہ افراد کو کسی حد تک اپنے اندر جذب بھی کر سکتا ہے، اور خود بھی اپنی محدود انفرادیت اور خودی کو قائم رکھتے ہوئے کسی زیادہ بڑے انا کے نظام کا جزو بن سکتا ہے، یہ مختلف انا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک دوسرے کو ابھارتے ہیں، گراتے ہیں، فیض بخشتے ہیں، اور فیضیاب ہوتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سب انائے کبیر سے جو ان کی حیات اور ہستی کا منبع ہے، فیضان حاصل کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں، ادنیٰ درجے کے اناؤں کے لئے تو حصول فیضان کی صورت انفعالی اور بالعموم غیر شعوری ہوتی ہے، لیکن بشری انا کے ارتقاء کا معیار یہی ہے کہ وہ فاعلانہ طور پر اور سرگرم پیکار ہو کر اس ربانی فیضان کو جس قدر ہو سکے، اپنے اندر جذب کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو"، اسی لئے اقبال کہتا ہے کہ مرد کامل نہ صرف مادی دنیا پر حاوی ہو کر اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، بلکہ وہ تو ربانی صفات کا اکتساب کر کے خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے" یہی وجہ ہے کہ اقبال ہمت مردانہ کے لئے یزداں بہ کمند آور کا نصب العین پیش کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ منصور حلاج کے مشہور مقولہ انا الحق کو بنظر استحسان دیکھتا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کے نزدیک بشری انا کی خصوصیات کیا ہیں، اور بالخصوص وہ کونسی خاصیت ہے جو اس انا کو (انائے کبیر کو چھوڑ کر) باقی تمام اناؤں سے ممتاز کرتی ہے، یہ صفت جو بشری انا کا طغرائے امتیاز ہے، اور اس کیلئے حد فاصل کا کام دیتی ہے، صفت تخلیق ہے اور اسی کی طرف اب ہمیں متوجہ ہونا چاہئے، اقبال سے پہلے چند صدیوں سے ایشیائی مفکرین اور حکمائے بالعموم اور اسلامی دنیا کے حکمائے بالخصوص انسان کی، بلکہ خود خدا کی تخلیقی صفت کو اپنے فکر کی تعمیر کرتے ہوئے کم و بیش نظر انداز کر دیا تھا، اقبال نے اس موضوع کو جس جامعیت اور تنوع سے اپنے کلام میں اور اپنے فلسفے میں پیش کیا ہے وہ ایشیائی فکر و فہم پر اور دنیائے اسلام کے اصحاب فکر پر احسان عظیم ہے،

بشری انا کی سب سے پہلی صفت اور صفت تخلیق کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے سب سے اہم صفت یہ ہے کہ یہ انا شعور کا ایک بے شکل اور روحانی مرکز ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوق میں انسان کے سوا اور کوئی شے اپنے اندر یہ روحانی عنصر رکھتی ہی نہیں ہے، آخر اس مادی دنیا کو بھی خدا نے ہی پیدا کیا ہے، جو شے پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے پیدا کرنے والے کا رنگ روغن کسی حد تک اپنے اندر لئے ہوتی ہے، اب خدا خود کچھ بھی ہو، روح کبیر ضرور ہے، اسی لئے وہ مادی دنیا، جو اس نے پیدا کی ہے، درحقیقت اپنی مادیت میں بھی روحانی عنصر کو چھپائے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے کہ اس مادیت میں بھی انا کے

امکانات موجود ہیں، وہ شے بھی جسے ہم جسم محض کہتے ہیں، اور بالکل بے حس، بے جان، اور بے زبان سمجھتے ہیں، اپنے معین وقت یعنی اس وقت جب اس کو اس کے خالق کا امر پہنچتا ہے، زندہ اور گویا ہو جاتی ہے، کیونکہ بالآخر اس کا دارومدار اسی روح کبیر پر ہے، جس نے انسان کو شعور اور روحانیت بخشی ہے، مثلاً قرآن فرماتا ہے کہ یوم حساب کو مومنوں پر ظاہر ہوگی، اور انسان کے ہاتھ اور پاؤں اس کے کاموں کے متعلق گواہی دیں گے، غرض مادی دنیا کی مادیت بھی کوئی اٹل شے نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت اضافی اور ثانوی ہے، بشری انا میں اور اس مادی دنیا میں جو اس کا ماحول بنتی ہے، اشتراک اصل ہے، اور ایک خاص اور لطیف مناسبت ہے اسی اشتراک اور مناسبت کی وجہ سے انسان اس قابل ہے، کہ اپنے ماحول سے تعامل کر سکے، اگر یہ ماحول اپنی اصل و فطرت میں بشری انا سے بالکل مختلف ہوتا، تو وہ اس کے فکر و عمل کی گرفت سے ہمیشہ باہر رہتا، اور یہ ناممکن ہوتا، کہ انسان اس سے کسی قسم کا تعامل کر سکے، یا اُسے سمجھ سکے، لیکن یہ امر واقعہ ہے، کہ انسان اپنے ماحول کو سمجھتا بھی ہے، اور اس سے تعامل بھی کرتا ہے، تعامل و تفقہ دونوں کی بنیاد یہی اشتراک اصل ہے، اور یہ اصل ہے، وہ منبع روحانیت جسے ہم خدا کہتے ہیں، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ انسان اس مادی ماحول سے مطمئن نہیں ہے، اُس کی دلی کیفیت کچھ ان پردیسیوں کی سی ہوتی ہے، جو جب کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں، تو سب کچھ بھولے ہوتے ہیں، لیکن جب انھیں کچھ فراغت نصیب ہوتی ہے، تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دیس کے خواب دیکھتے ہیں اس افسردگی اور لگن کی وجہ یہ ہے کہ عالم موجودات میں بشری انا کا درجہ ان کم رتبہ خوابیدہ، از خود ناآشنا، خاموش و بے زبان اور مبہم اناؤں سے بہت بلند ہے، جو مل ملا کر مادی دنیا کا نام پاتے ہیں، ان کم مرتبہ اناؤں کے بھی کئی درجے ہیں، اور جو ان میں سے کمترین ہیں، ان کی روحانیت تو بالکل عالم سکوت میں ہوتی ہے، ان کے متعلق ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ صحیح معنوں میں انا نہیں ہیں، لیکن ان میں امکانات انا مضمر ہیں، انسان کا اپنا جسم گویا ہے، وہ کم درجہ اناؤں کی ایک بستی ہے، جس میں سے ایک اعلیٰ درجہ کا انا اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب ان کم درجہ اناؤں کا باہمی تعامل اور تعلق اعلیٰ قسم کا حُسن ترتیب اور ربط حاصل کر لیتا ہے (اقبال) وہ مبہم اور خاموش انا جن سے انسان کا مادی ماحول بنا ہے، آپس میں اس درجہ مربوط نہیں ہیں کہ وہ انسان کے لئے حقیقی وطن کا کام دے سکیں، یہی وجہ ہے کہ ہر از خود آشنا انا اپنے ماحول سے غیر مطمئن رہتا ہے،

بشنو از نے چون حکایت می کند

از جدائی ہا شکایت می کند

اب سوال یہ ہے کہ انائے کبیر نے بشری انا کو اس ناسازگار ماحول میں ڈالا کیوں؟ اقبال حکمت قرآن کے مطابق جواب دیتا ہے، کہ اس میں ایک ربانی مقصد کار فرما ہے اور وہ مقصد ہے بشری انا کی ایسی تشکیل و تکمیل کہ وہ انائے کبیر سے قریب تر ہو جائے، قرآن میں اللہ فرماتا ہے، کہ ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل میں نہیں بنایا، اس کارخانۂ کائنات میں ایک مقصد عظیم کار فرما ہے، انسان کا یہ مادی ماحول نہ تو کلیۃً ناسازگار اور نامناسب ہے، اور نہ کلیۃً مناسب و سازگار، نہ تو وہ اس قدر بیگانہ ہے، کہ انسان اُس میں بود و باش ہی ناپسند کرے، اور نہ وہ اس قدر مانوس اور خوش گوار ہے، کہ انسان کو اُس کی ہر ادا بھائے، اور وہ اس کی گود میں میٹھی نیند سو جائے، ایسا ماحول ہی انا کی تربیت و تہذیب کے لئے موزوں اور مفید ہو سکتا ہے،

اقبال ان ماہرین سے متفق ہے، جن کے نزدیک شخصیت کا جوہر اُس کا تناؤ ہے، یعنی اس کی شوخی و تندی ہے اس تناؤ کے بغیر شخصیت محض ایک اسم بے مسمّیٰ ہے،

گران بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

انسان کا مادی ماحول اس کی شخصیت کے تناؤ کو شدید مضبوط اور مربوط بنانے میں یعنی اُسے زیادہ شوخ اور زیادہ تند بنانے میں ممد ہوتا ہے، ماحول کی بے گانگی اور ناسازگاری نہ اس قدر زیادہ ہونی چاہئے، کہ انا فرار کی طرف مجبور ہو جائے اور نہ یہ ماحول اس قدر خوشگوار اور دلفریب ہونا چاہئے، کہ انا اُس میں اپنے آپ کو کھو بیٹھے، ہمارا انکرا اپنے وظیفے کی ادائگی میں زیادہ سے زیادہ کامیاب اس وقت ہوتا ہے، جب اس کا سامنا ہوتا ہے کسی ایسے حیران کن پُرخطر اور نئی صورت حال سے جس سے صحیح تعامل کے لئے اس کے پاس گذشتہ مشاہدات اور تجربات کے مفید اور بنے بنائے نتائج موجود نہ ہوں ایسے حالات میں فکر مجبور ہو جاتا ہے، کہ کامیاب تعامل کے لئے نئے نئے طریقے اختراع کرے، اور گذشتہ مشاہدے اور تجربے کے مناسب حال اجزا کو نئی ترکیبیں دیکر ایسے نتائج حاصل کرے، جن کا پہلے اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا، اسی طرح ہمارا انا بھی اپنے ماحول کی قدرے موافق اور قدرے ناساز گار اور تکلیف دہ فضا میں تقویت حاصل کرتا ہے، اور اپنی وہ خوبیاں معرض وجود میں لاتا ہے، جو کسی سراسر موافق فضا میں ہرگز ظاہر نہ ہوتیں، یہ قدرے ناسازگار فضا انا کو اپنی ذات سے آگاہ کرتی ہے، کیونکہ انا اپنے آپ کو ماحول سے مختلف پاتا ہے،

انا کا ماحول سے یہ تعامل کوئی انفعالی حالت نہیں ہے، یہ تو ایک تفاعل ہے، جس میں انا ماحول میں ہوتے ہوئے، اُس سے کامیاب تعامل کرتے ہوئے، اپنی تعمیر آپ کرتا ہے، ماحول میں سے انا اپنی ضروریات کے مطابق وہ وہ اجزا چن لیتا ہے، جو اس کے مناسب حال ہوتے ہیں، انا کی تعمیر کوئی غیر نہیں کر رہا، ماحول اُسے نہیں بنا رہا، انا بن نہیں رہا، حقیقت یہ ہے کہ انا خود اپنی تعمیر (یا تخریب) میں مصروف ہے، اور اس کام میں وہ فاعلانہ انداز سے ماحول کی تمام ایسی قوتوں سے اشتراک عمل کر رہا ہے، جو اُس کی اس تعمیر میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں، یہ صحیح ہے کہ اسکی ہستی و ذات کا سرچشمہ انائے کبیر ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی تعمیر جس ربط کی ممنون احسان ہے، وہ ربط ایک حد تک ماحول خارجی کا نتیجہ ہے، یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان اثرات کے ساتھ ساتھ انا اپنی خودی کی تعمیر میں فاعلانہ طور پر مصروف ہے، اور اگر وہ اس انداز سے مصروف کار نہ ہو تو وہ انا نہ رہے گا، بلکہ اس رتبے سے گر جائے گا، خودی کی یہ تعمیر ہی وہ ربانی مقصد ہے جس کے حصول کے لئے انا کو پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے اقبال تعمیر خودی پر بہت زور دیتے ہیں، اور اسے وہ انسانی زندگی کا اہم ترین فرض سمجھتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں، اگر ہم انسان کو عالم مکان میں دوسری اشیاء کی طرح) صرف ایک شے تصور کرلیں، تو ہم ہرگز اس کی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے، انسان کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے اس کی تصدیقات میں، اس کے ارادوں میں اس کے مقاصد میں، اور اس کی آرزوؤں میں یہی وہ حالتیں ہیں جن میں اسکی خودی کی نمائش ہوتی ہے، اور جن میں اس کا انا زندگی بھر کی کاوشوں اور کارگزاریوں کا نچوڑ ایک ایک لمحے میں پیش کر سکتا ہے،

متذکرہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی خودی کی تخلیق کرتا ہے، اور یہ تخلیق کوئی شاعرانہ استعارہ نہیں ہے، بلکہ ایک امر واقعہ ہے اور حقیقت ہے، انا اپنی ہی ہمتِ مردانہ سے خودی کے درجہ تک پہنچتا ہے، لیکن تخلیق خودی کی یہ خاصیت تحت البشر اناؤں کے متعلق صحیح نہیں ہے، اور نہ ہی ہر بشری انا اس لحاظ سے دوسروں کے برابر ہے، بعض اناؤں میں یہ خاصیت بدرجۂ ادنیٰ پائی جاتی ہے، اور بعض میں بہت کم، اگر تمام بشری اناؤں کو ایک سلسلہ وار ترتیب

دیا جائے، تو چوٹی پر وہ انا ہوں گے، جن کی خودی اپنے ربط اور شدت میں بہترین ہے، اقبال کا خیال ہے کہ خودی کا بہترین ربط درحقیقت خودی کا وہ شدید تناؤ ہے، جو اُسے عشق سے حاصل ہوتا ہے، یہ عشق کیا ہے، اقبال کہتا ہے کہ عشق قانون ہے انفرادیت کا اور تفاعل جاذب کا، عشق انا کو مضبوط تر بناتا ہے، اس کے برعکس سوال انا کو کمزور کر دیتا ہے، اور سوال کیا ہے؟ سوال ہے وہ سب کچھ جو انسان کو، اپنی قوتِ بازو اور عمل کے بغیر ملتا ہے، سوال تباہ کن فقر کی نشانی ہے اور عشق فقر صحیح کا فخر ہے، عشق و سوال متضاد کیفیتیں ہیں، ایک سے خودی کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے، اور دوسرے سے اسکی تخریب اور موت، ایک سے کائنات کے راز فاش ہوتے ہیں اور دوسرا انا کو خود اپنے سے ناآشنا و غافل کر دیتا ہے،

فقر و عشق کے موضوع بہت وسیع ہیں، اور اقبال نے اپنے کلام میں ان پر سیر حاصل بحث کی ہے، یہاں گنجائش نہیں ہے کہ ان دو موضوعوں پر اقبال کے خیالات کا جائزہ لیا جائے اس امر کے لئے مستقل عنوان چاہئیں، اور یہ امید رکھنی چاہئے کہ کوئی صاحبِ ذوق و فہم اس طرف متوجہ ہوگا، ہمیں اپنے موضوع (یعنی بشری انا کی تخلیقی استعداد) کے سلسلہ میں صرف یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اقبال کے لئے عشق عالم کشائی کے لئے ایسا ذریعۂ قوت ہے جس سے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو کسی اور طریقہ سے نہیں ہو سکتا، عشق انسان کو انسان بناتا ہے کیونکہ اس سے ہی انسان کی شخصیت اپنی انفرادیت اور ربط پاتی ہے، اور پھر اس عشق کی بدولت ہی وہ ظاہر و باطن کے راز فاش کرتا ہے، گویا کہ عشق ایک ربانی فیضان و ذریعۂ قوت ہے، جو اللہ کی مخلوق میں صرف یا کم از کم صحیح طور پر صرف انسان کی شخصیت میں ہی ساری ہو کر اپنے تخلیقی جوہر دکھاتا ہے ع نوائے عشق را ساز است آدم،

ہم نے دیکھا ہے کہ بشری انا اپنے ماحول سے تفاعل و تعامل کرتا ہے، اور یہ تعامل ایسا نہیں ہے، کہ صرف ماحول ہی انسان پر اثر انداز ہو بلکہ انسان خود اثر انداز ہوتا ہے ماحول پر اور اس کے موادِ خام کو اپنی ضروریات خواہشات ارادے اور فکر کے مطابق ترتیب دیتا ہے، بشری انا ایک فاعل انا ہے، اور اس کے لئے بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں انا ہو) ناممکن ہے، کہ ماحول کی صورتِ حال کو جوں کا توں قبول کرے، اور اسے اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کیلئے سرگرم عمل نہ ہو، اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان عالمِ موجودات میں سیر و سیاحت کے لئے نہیں بھیجا گیا اُسکی تخلیق کسی بلند مقصد کے تحت ہوئی ہے اور وہ بلند مقصد یہ ہے، کہ وہ اپنی خودی کی ایسی تعمیر کرے کہ وہ اپنے خالق کا شریکِ کار بن سکے،

نوائے عشق را ساز است آدم	کشاید راز و خود راز است آدم
جہان او آفرید، این خوب تر ساخت	مگر با ایزد انباز است آدم

انا کا اپنے ماحول سے تعامل ایک قسم کا انجذاب بھی ہے، انا ماحول کے مناسب اور ضروری اجزا کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اقبال کے خیال میں اس انجذاب کا ذریعہ بھی عشق ہی ہے، اس انجذاب کو ہم حیاتیاتی تمثیل کے مطابق سمجھ سکتے ہیں، مردہ زمین میں بیج گرتا ہے پانی ہوا اور سورج کا بیج اور اس کی زمین سے تعامل ہوتا ہے، یہ سب مل کر ایک نئی شے یعنی پودا پیدا کرتے ہیں، بیج کے اندر جو حیاتی صلاحیتیں مخفی تھیں وہ کبھی معرض وجود میں نہ آتیں، اگر یہ خاص ماحول نہ ہوتا، اور پھر اس خاص ماحول سے بیج کا تعامل نہ ہوتا، ماحول نے ان خوابیدہ اور مخفی خاصیتوں کو بیدار کیا، اور جونہی کہ یہ خاصیتیں بیدار ہوئیں، انھوں نے ماحول سے تمام وہ اجزاء اخذ کرنا شروع کر دیے جو پودے کی انفرادیت کے لئے مناسب اور ضروری تھے، اس سے ظاہر ہوا کہ صحیح تعامل ہمیشہ انتخابی ہوتا ہے، اسی طرح ہر انا کا تعامل اپنے ماحول سے ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ بشری انا کا تعامل درحقیقت تفاعل ہوتا ہے یعنی وہ بسا اوقات شعوری ارادی اور صحیح معنوں میں فاعلانہ ہوتا ہے، ایسا خود اختیارانہ تعامل عالم موجودات کو کبھی اٹل اور ناقابل ترمیم مان نہیں سکتا، بلکہ وہ ہر وقت

اس دھن مین ہوتا ہی کہ جب موقع ملے، وہ اسے اپنے ارادی اور مقصد کے مطابق بنائے بگاڑے، جوڑے اور توڑے، اور ان طریقون سے اپنی تخلیقی استعداد کو پھیلنے کا موقع دے، خود اختیارانہ تخریب و تعمیر درحقیقت انا کی قاہری ہے، اور

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہین جس کو سلطانی،

اس کے برعکس اگر انا کا اپنے ماحول سے تعامل محض انفعالی ہے، اور وہ راضی برضائے خدا ہونے کے بجائے راضی برضائے کائنات ہوچکا ہے، یعنی اگر اوس نے عالم ہست و بود کو جون کا تون اور ناقابلِ ترمیم و اصلاح تسلیم کرلیا ہے، تو وہ انا اپنی اس بے حس تسلیم کی وجہ سے ہی جامد و ساکن اور مردہ ہوجاتا ہے، اقبال انا کے اس انحطاط اور خمود کو کفر کا لقب دیتا ہے،

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق مین گم ہے، — مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس مین ہین آفاق

ایسا کافر انا تخلیق کے قابل نہین ہوتا، بلکہ اُسے تو انا بھی نہ کہنا چاہیے،

تری نگاہ مین ثابت نہین خدا کا وجود — میری نگاہ مین ثابت نہین وجود تیرا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا

اقبال ہرگز اس جہانِ رنگ و بو کو اٹل ماننے کے لئے تیار نہین ہے، وہ تو اُسے خودی کے جوہرِ تخلیق کا منتظرِ احسان سمجھتا ہے،

شام و سحرِ عالم از گردشِ ما خیزد — دانی کہ نمی سازد این شام و سحر ما را

انا جب اپنی خودی سے آگاہ ہوتا ہے یا یون کہئے کہ انا نے جب اپنی خودی کی تعمیر کرلی تو وہ اپنے سامنے نئی دنیائین کھلتی دیکھتا ہی، اُسکا پہلا ماحول اس کیلئے تنگ ہوجاتا ہے، (شایانِ جنونِ من پہنائے دوگیتی نیست) اس کی نظر زیادہ جسور اور شوخ، اس کی امنگ بے قید، اس کا بازو ہمہ گیر اور اسکی گرفت مضبوط تر ہوجاتی ہے، نگاہ ما بہ گریبانِ کہکشان افتد، ایسا انا اپنے تخلیقی جوش سے سرشار و مجبور ہوکر بول اٹھتا ہے

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکان شوخیِ افکارِ من است

کیا یہ دعویٰ مجذوب کی بڑ ہی یا اپنی حقیقت ہی؟ شاعر کا مبالغہ ہی یا امرِ واقعہ کا اقرار؟ یہ بحث لمبی ہے، اقبال مبالغہ کا قائل نہین ہی، اسلئے اس کے فلسفہ کی صحیح تعیین کے لئے ہمین یہ دیکھنا کہ ان اور ایسے دوسرے اشعار مین "من" سے کیا مراد لیتا ہی، ظاہر ہی کہ یہ من وہ انا فرد ہی، لیکن صوفیہ اور حکما کا ایک گروہ ایسا گذرا ہے جن کی تعلیم یہ تھی کہ یہ من درحقیقت بشری انا نہین ہے بلکہ اس کی وہ حالت ہے جب وہ اپنی معراج پر پہنچ کر انائے کبیر مین مل جاتا ہی، اقبال کی تعلیمات سے اس عقیدہ کی تائید نہین ہوتی، لیکن ایک دوسرا گروہ ہی جن سے (کم از کم اس اہم امر مین) اقبال متفق نظر آتا ہے کہ انا کی معراج یہ نہین ہے کہ وہ انائے کبیر مین ضم ہوجائے بلکہ وہ اس سے اس طرح سیراب اور فیض یاب ہوتا ہے کہ انائے کبیر کی تخلیقی فعلیت کمال جوش و خروش سے اس مین جاری و ساری ہوجاتی ہے جس طرح مثلاً طوفان زدہ سمندر کی لہرین ساحل کے ان علاقون مین طغیانی لاتی ہین جو اپنی افتاد کی وجہ سے اس سیلاب کو قبول کرنے کے لائق ہوتی ہین، فرق یہ ہی کہ ساحل کا قبولِ فیضان انفعالی ہوتا ہی اور انسان کا فاعلانہ، بشری انا کو اپنی تہذیب و تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ وہ اس سیلاب کے فیضان کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے قابل ہوجائے، آنحضرت صلعم کا ارشاد کہ اپنے اندر ربانی صفات پیدا کرو اس معنی مین لیا جاسکتا ہی، ایسا پختہ کار انا اپنی کسی خاص حالت جذب مین انا الحق بھی پکار اٹھتا ہی اور چونکہ اقبال نے منصور حلاج کے اس قول کو متعدد بار بنظرِ استحسان پیش کیا ہے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہین کہ انائے کبیر اور بشری انا کے باہمی رشتہ کے متعلق اقبال کا اپنا نظریہ بھی کچھ ایسا ہی ہی، اس سے ہرگز یہ مراد نہین ہی کہ اقبال حلاج کے الہیاتی نقطۂ نظر کو بالکلیہ قبول کرلیتا ہی، ہان یہ صحیح ہی کہ اس کے نزدیک دعوائے انا الحق کی یہی تاویل قابل قبول ہے (باقی)

چند استدراکات

"بوہرے"

(۱)

از جناب مہر محمد خان صاحب شہاب مالیر کوٹلوی، بمبئی،

مئی ۴۴ء کے معارف مین "بوہرے" کے عنوان سے ایک استفسار کا جواب شائع ہوا تھا، جس مین ان کی مختصر سرگذشت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے اخذ کرکے درج کی گئی تھی، اور تفصیلات کے لئے اس موضوع پر کام کرنے والے صاحب علم مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیدیا گیا تھا، افسوس ہی کہ معارف کے مندرجہ جواب مین بعض تسامحات پیش آگئے، جن مین سے بیشتر اس کے ماخذ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ مین ہین، ان مسامحات کی تصحیح کے لئے دو صاحب علم نے توجہ فرمائی، ذیل مین اُن کے مراسلے یکے بعد دیگرے پیش ہین،

"س"

معارف کا یہ بیان کہ داؤدی بوہرون کی مذہبی کتابین مستور رکھی گئی ہین بجا ہے، اس کی وجہ یہ ہی کہ وہ تمام جماعتین جو اقلیت مین ہون، اور کوئی زبردست انقلاب ان کا مطمحِ نظر ہو، وہ کتمان سے کام لیتی ہین، یہی وجہ ہی کہ ان کے متعلق لکھنے والون سے اکثر غلطیان ہوجاتی ہین، مگر اب حالات بدل رہے ہین، یورپ کی زبانون مین مسلمانون کے متعلق عموماً اور ان کی خاص خاص معروف اور غیر معروف جماعتون کے بارے مین خصوصاً اہل علم کی طرف سے صحیح معلومات فراہم کرنے کی کوششین مسلسل اور متواتر جاری ہین، علاوہ اور زبانون کے انگریزی زبان مین کئی قابلِ توجہ کتابین اسماعیلیون کے متعلق لکھی گئی ہین، ان مین سے ایک کتاب خلافتِ فاطمیہ کی تاریخ ہی جس کے مصنف برسٹل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی، لے کی، او- لی- آ- ری- ڈی- ڈی (Delacy O- Leary D.D) ہین یہ کتاب لندن اور نیویارک سے ۱۹۲۳ء مین شائع ہوئی تھی، اور راقم الحروف کی نظر سے گذر چکی ہے،

پھر یہان بمبئی مین سالہا سال سے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن قائم ہے، جس کے روح رواں فاضل محترم مسٹر آصف فیضی ایم اے کینٹب بیرسٹرایٹ لا، پرنسپل، گورنمنٹ لا کالج بمبئی ہین، یہ ایک علمی ایسوسی ایشن ہی جس کی رکنیت مین مشرق و مغرب کی قید اور مذہب و لامذہبی کی پابندی نہین ہے، اس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ ہے کہ مغرب کے اعلیٰ ترین تنقید و تحقیق کے طریقون سے کام لے کر اسلامیات کے ان شعبون کے بارے مین علمی تحقیقاتین کی جائین، جن کے متعلق اب تک کام نہین ہوا، یا بہت کم ہوا ہی، اس ایسوسی ایشن کے ارباب بست و کشاد کی شائع کردہ دس کتابون مین سے سات امامیہ مذہب کی مختلف شاخون مثلاً فاطمی دعوت اور اثنا عشری مذہب کے بارے مین ہین، ان کتابون مین فاطمیون یا دولت فاطمیہ کا عروج، موسیو ڈبلیو- اے- وا- نو- ایک روسی کی انگریزی زبان مین لکھی ہوئی کسی قدر مناظرانہ قسم کی تاریخ ہے، موصوف نے اپنی عمر کا خاصہ حصہ اسماعیلیات کے متعلق تحقیقات

مین صرف کیا ہے، اس کتاب مین انگریزی کے، ۳۳ صفحون کے علاوہ ۱۳ صفحے عربی کے ہین، جو مستعلوی فاطمیون کی مذہبی غیر مطبوعہ کتابون کے اقتباسات ہین، اسی موضوع پر موسیو آئی وانو کی اور بھی کتابین اور تحریرین موجود ہین،

اب رہا اردو لٹریچر تو معارف کے مضمون مین جن کتابون کے نام لئے گئے ہین، وہ مناظرانہ رسالے ہین، جو آج سے چوبیس پچیس برس پہلے داؤدیون کی آپس کی آویزش کے سلسلہ مین جواب وسوال اور رد و قدح کی صورت مین لکھے اور لکھوائے گئے تھے، اتفاق کی بات ہے کہ جناب ملا سیف الدین صاحب داعی جماعت داؤدیہ کے رسالہ "ضوء نور الحق المبین" کے جھگڑے کے وقت کا خاصہ موافقانہ و مخالفانہ لٹریچر میرے پاس موجود ہے، فریقین کے لکھنے والون مین سے بعض سے میری ذاتی واقفیت تھی، مگر ان رسالون سے کوئی مفید معلومات حاصل نہین ہوتے، ان سے قطع نظر اردو مین چند اور کتابین موجود ہین، جن سے بہت کچھ معلومات حاصل کئے جا سکتے ہین، ایسی کتابون مین سب سے پہلے مولوی نجم الغنی خان مرحوم رامپوری کی کتاب "مذاہب اسلام" کا وہ حصہ ہے جو اسماعیلیون کے متعلق ہے، یہ مضمون اغلاط سے پر ہے، دوسری ابن العذاری کی تاریخ مغرب، پروفیسر مولوی جمیل الرحمن ایم اے، استاذ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو چھپ چکا ہے، اس کا مصنف فاطمیون کا مخالف ہے، اس لئے یہ کتاب ہر قسم کی صحیح اور غیر صحیح باتون سے بھری ہوئی ہے، اس کے بعد پروفیسر مرزا سعید ایم اے دہلوی کی کتاب "مذہب اور باطنیت کی تعلیم" ہے، پروفیسر صاحب کا ماخذ زیادہ تر انگریزی کتب ہین، یہ کتاب اچھی اور بہت دلچسپ ہے، اس مین غیر جانبداری اور انصاف سے کام لیا گیا ہے، کم از کم مؤلف کو اسماعیلیون سے کوئی پرخاش نہین، لیکن غلطیون سے یہ بھی خالی نہین، پروفیسر صاحب مستعلویون یا مصری فاطمیون کے حق مین ہین، اور نزاریون یا آغاخانیون کے حق مین نہین ہین، نزاریون یا آغاخانیون کے نقطۂ نظر سے بھی اردو مین اسماعیلیون کی ایک تاریخ بنام "نور المبین" حبل اللہ المتین" مسٹر علی محمد جان اڈیٹر اخبار اسماعیلی نے خواجہ سندھی پرنٹنگ پریس بمبئی مین چھپوا کر ۱۹۳۰ء کے بعد شائع کی تھی، اس کتاب کی ضخامت سات سو ساٹھ صفحات ہے، تصویرون سے آراستہ اور کتابت کی غلطیون سے پر ہے،

اردو و فارسی انگریزی کے علاوہ قریب کے زمانہ مین عربی مین بھی متعدد نئی کتابین اسماعیلیون کے بارے مین مصر مین شائع ہو چکی ہین جن مین سے کم سے کم دو کا مجھے علم ہے، ایک "الفاطمیون فی مصر" ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصری) کی محققانہ تالیف ہے جو راقم کی نظر سے گذر چکی ہے، دوسری کتاب ایک اور مصری فاضل زکی حسن کی تصنیف ہے، جس کا نام "کنوز الفاطمیین" ہے، اس کتاب مین مصر کے فاطمیون کے عہد کے علوم و فنون کی تاریخ درج ہے، یہ دونون کتابین میرے فاضل دوست ڈاکٹر حسین الہمدانی استاذ عربی اسماعیل کالج بمبئی کے ذاتی کتب خانہ مین موجود ہین،

اب مین ان چند موٹی موٹی باتون کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتا ہون جو صحیح نہین ہین،

۱- نزار کو معارف مین الحاکم بامر اللہ کا بیٹا بتایا گیا ہے، اور لکھا گیا ہے کہ الحاکم کے بعد فاطمی یا اسماعیلی امامت دو حصون مین تقسیم ہو گئی، حالانکہ نزار الحاکم کے بیٹے نہ تھے، بلکہ خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی کے بیٹے تھے، الحاکم خلفاء فاطمی مین چھٹے خلیفہ تھے، اور مستنصر باللہ آٹھوین خلیفہ تھے، فاطمی خلفاء مین ساتوین خلیفہ جو الحاکم اور المستنصر باللہ کے درمیان تھے، ان کا نام الظاہر تھا، اور انہی الظاہر کے بیٹے مستنصر باللہ تھے، المستنصر باللہ نے ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۵ء سے ۴۸۷ھ مطابق ۱۰۹۵ء تک مصر مین حکومت کی، انہی کے زمانے مین حکیم ناصر خسرو مصر گئے، اور اس خلیفہ کا ذکر حکیم مذکور کے سفرنامہ مین موجود ہے، سفرنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ کس شان و شکوہ اور کن خوبیون کے خلیفہ تھے، انہی المستنصر باللہ فاطمی اسماعیلی کے بڑے بیٹے نزار

[illegible]

اور چھوٹے بیٹے مستعلی تھے، جو فاطمی خلفاء کے سلسلہ مین تاریخ مین نوین فاطمی خلیفہ کہلائے، نزاریون اور مستعلویون کا اختلاف یہی بڑا اختلاف ہے، نزاری کہتے ہین کہ نزار وصی تھے، اور مستعلی وصی نہ تھے، اور مستعلی کو ماننے والے اس کے خلاف کہتے ہین لیکن تاریخ یہی کہتی ہے کہ خلیفہ مستنصر باللہ کے بڑے لڑکے نزار باپ کی وفات پر مصر کی سلطنت سے محروم رہے، اور چھوٹے بیٹے مستعلی اٹھارہ برس کی عمر مین اپنے باپ کے وزیر اور اپنے خسر کی حمایت سے تخت خلافت پر بیٹھے، نزار یہ رنگ دیکھکر روپوش ہو گئے، خلیفہ مستعلی کے پیرو داؤدی اور سلیمانی ہین، اور نزار کے پیرو آغاخانی خوجے یا اسماعیلی شیعہ کہلاتے ہین، ہز ہائی نس سر سلطان محمد آغاخان کو براہ راست نزار کی نسل مین تسلیم کرکے امام حاضر مانا جاتا ہے، داؤدیون اور سلیمانیون کا امام ایک ہے، اور داعی الگ الگ، اس شاخ کے امام غائب یا مستور ہین، اور "داعی مطلق" موجود ہین،

۲- داؤدی جناب ملا طاہر سیف الدین کو "امام نہین" "داعی مطلق" مانتے ہین، ان کے ہان امام کا اولاد علیؓ و فاطمہؓ سے ہونا ضروری ہے، اور ملا صاحب اولاد فاطمہؓ و علیؓ سے نہین ہین، امام کو علوی و فاطمی ہونے کے علاوہ اسی سلسلہ مین ہونا چاہئے، جو ان کے ہان مسلمہ ہے، داعی غیر فاطمی بھی ہو سکتا ہے، جسے امام یا امام کا داعی مطلق مقرر کرے، امام اور داعی مین وہی فرق ہے، جو شاہ اور وزیر مین ہوتا ہے، امام مالک ہے داعی مملوک، یہی وجہ ہے کہ ملا صاحب اپنے نام کے ساتھ آل محمد کا غلام اور امام کے آزاد کردہ غلامون کا "غلام" وغیرہ لکھا کرتے ہین، جس کے معنی یہ ہین کہ ملا صاحب امام نہین، بلکہ امام کوئی دوسرا ہے، یہان امام کے معنی عام لیڈر اور پیشرو کے نہین لئے جا سکتے کیونکہ جس جماعت کے متعلق گفتگو ہے، ان کے ہان امامت اصول مذہب مین داخل ہے، اس کے وہی معنی لئے جائین گے جو ان کے ہان مسلم ہین،

۳- فاطمیون کی کتاب کا نام "دائم الاسلام" درست نہین، بلکہ صحیح نام "دعائم الاسلام"[1] ہے، جو قاضی نعمان فاطمی کی تالیف ہے، یہ کتاب فاطمی فقہ و شرع کی بہترین کتاب ہے، اب تک شائع نہین ہوئی ہے، اس کو اب فاضل محترم مسٹر آصف فیضی ایم اے بیرسٹر ایٹ لا، پرنسپل گورنمنٹ لا کالج سکریٹری اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی ایڈٹ اور ترجمہ کرنے کی فکر مین ہین، اس کتاب کا دوسری اسلامی فقہی کتابون مین مقابلہ کرنے سے اسلامیات کے طالب علم کو یقیناً بصیرت حاصل ہوگی،

(۲)

از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی، ریسرچ اسکالر، گجرات ورناکیولر سوسائٹی احمد آباد

مندرجۂ بالا عنوان سے معارف مئی ۱۹۴۸ء مین ایک سوال کا جواب شائع ہوا ہے، اس مین متعدد باتین تحقیق طلب ہین اپنے بعض بوہرے احباب کے اصرار پر اس مضمون کے متعلق سطور مندرجۂ ذیل مین ان کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہون،

(۱) بوہرہ "گجراتی لفظ "وہورو" سے نکلا ہے، یہ صحیح نہین ہے، بوہرہ اور وہرا (بوہرا اور وہرو) یہ دونون لفظاً اور معناً ایک ہی ہین، سنسکرت اور ہندی مین ب اور و کا تبادلہ ہمیشہ ہوتا ہے، جیسا کہ اہل زبان اس سے اچھی طرح واقف ہین، دراصل یہ لفظ سنسکرت کے مادہ (وہرا ور دیہ روہ) سے نکلا ہے، جس کے معنی لین دین کے ہین، پھر اسی سے "ویہ وہارک" (بیوپاری) نکلا جس کے معنی تاجر کے ہین، اور اسی لفظ سے تخفیف ہو کر "وہرو" ہو گیا، جس کو بوہرو کہتے ہین، مسلمانون نے اس کو بوہرہ بنا دیا، جیسے بگڑو سے بگڑا،

(۲) گجرات مین اسماعیلی مبلغ سب سے پہلے کون آیا، اس کے متعلق عام اسلامی تاریخون مین کوئی ذکر نہین ملتا ہے، گجرات

[1] یہ کتاب راقم کے مطالعہ مین ہے ... آئی اے فیضی نے دعائم الاسلام کے کچھ عربی اقتباسات اسلامک سوسائٹی کی شاخ بمبئی کے جرنل ۱۹۳۳ء مین شائع ہو چکے ہین ... [illegible]

گزیٹیر یا بعض یورپین لوگون نے محمد علی یا ملا علی لکھا ہے[1] اور کچھ لوگ عبد اللہ اور احمد کا نام لیتے ہین، ممکن ہو کہ ان نامون کے آدمی وقتی طور پر گجرات مین آکر تبلیغ کا کام کرتے ہون، لیکن تمام اسماعیلی تاریخیں اس پر متفق ہین کہ سرکاری طور پر سب سے پہلا مبلغ احمد نامی آیا تھا اور انہی کا مقبرہ کھنبائت مین ہے، ورنہ محمد علی نامی کسی والی کا مقبرہ کھنبائت مین نہین ہے، مولائی احمد مصر سے یمن ہو کر کھنبائت تشریف لائے، اور دو غیر مسلم (لڑکون کو مصر لیجا کر تعلیم دی)، اور گجرات واپس ہونے پر ان دونون کے توسط سے تبلیغ اسلام مین تمام عمر مصروف رہے، ان مین سے ایک کا نام نور الدین (سابق روپ چند) اور دوسرے کا عبد اللہ (سابق رام جی) رکھا، مولائی عبد اللہ مصر سے تعلیم حاصل کر کے گجرات واپس آئے، اور تبلیغ مین مصروف ہو گئے، مولائی احمد کی قبر پر جو گنبد ہے، وہ سیٹھ قائم علی طیب علی صاحب رئیس کھنبائت کا تعمیر کردہ ہے، اور مولائی عبد اللہ کی قبر پر تعمیر کردہ گنبد خان صاحب سیٹھ ملا غلام عباس بن غلام علی بن قائم علی رئیس کھنبائت کا ہے، اس پر قدیم کتبہ کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ہذا القبر ولی اللہ السمّی مولائی عبد اللہ۔

جدید کتبہ مندرجہ ذیل ہے:-

قبر ہذا الداعی مولائی عبد اللہ وھو اول من قام بالدعوۃ بامر الامام المستنصر باللہ داعیۃ داعی الجزائر ثلث[2]، فہدی اللہ اکثر اھل الھند، وبصاحبہ مولائی احمد وکان لھما نزو فی عصر جے سنگھ، سدھ راج، وقد استجاب لھما واسلم ذلک بین سنہ ۴۶۵ھ وسنہ [illegible] وبین سنہ [illegible] وفاتہ، قدس اللہ ونور روضہ وضریحہ فی اول شہر محرم الحرام،

یہ قبر بوہرون کے قبرستان مین بلندی پر واقع ہے، سنگ مرمر کا کام اچھا ہے، قدیم عمارت کے عوض جدید گنبد بعہد سیدنا طاہر سیف الدین تعمیر ہوا ہے، ساتھ ہی فاتحہ خوانی اور عرس کے لئے جماعت خانہ بھی ہے، نیم کے درخت کے نیچے بنچین بھی مسافرون کے لئے رکھی ہین، صبح کے وقت عموماً عورتین اور شام کے وقت مرد زیارت کے لئے آتے ہین، آس پاس کی زمین بھی خرید لی ہے، پرفضا جگہ ہے، بر سر بالین قدیم کتبہ ہے، اور دیوار کے پاس جدید مولائی احمد کی قبر پر جو گنبد ہے، وہ سیدنا برہان الدین کے عہد کا ہے، آپ کی قبر بنیون کے قبرستان کے وسط مین واقع ہے، قبر پر عالیشان گنبد ہے، جماعت خانہ بھی اسی سے متصل ہے، چھت پر سے بڑا پرلطف نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے، صحن کے نیچے ٹنکی ہے جو برساتی پانی سے لبریز رہتی ہے، ایک گوشہ مین بشکل کنوان بنی ہے جہان سے پانی نکال کر استعمال کر سکتے ہین، قبر پر آپ کی وفات کی تاریخ ۱۰ محرم ہے، لیکن عرس ۱۶ محرم کو ہوتا ہے، یہ جگہ پہلے سمندر سے قریب تھی، اب دور ہو گئی ہے،

میرے اس مفصل بیان سے واضح ہو گیا ہوگا، کہ اول داعی مولائی احمد تھے، جیسا کہ ان کی قبر کے کتبہ سے ظاہر ہے، اور اس جماعت کی تاریخی کتب اس کی موید اور شاہد ہین[3]،

(۳) "یوسف بن سلیمان ۹۴۶ھ مین ہندوستان آیا، اور اس نے سدھ پور مین اقامت اختیار کر لی"، اس واقعہ کی نوعیت یون ہے، کہ سیدنا یوسف نجم الدین بن سلیمان کی ولادت سدھ پور (گجرات) ہی مین ہوئی، اور ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ حاصل کی، پھر احمد آباد آکر ملا قاسم بن حسن سے تعلیم حاصل کی، پھر یمن جاکر اس کی تکمیل کی، ہندوستان واپس آنے پر سدھ پور کا عامل (کلکٹر) ان کی اپنی خواہش پر بنا دیا گیا، عرصہ تک اسی جگہ اسی عہدہ پر مامور رہے، سیدنا محمد عز الدین یمنی داعی مطلق نے اپنی وفات

[1] مجالس المومنین جلد اول [2] مجالس سیفیہ مجلس ۵ و موسم بہار جلد سوم بمبئی [3] یمن گجرات سندھ [4] مجالس سیفیہ موسم بہار نزہۃ الافکار وغیرہ

کے وقت منصوص (جانشین) بنایا، چنانچہ ۹۴۶ھ مین اس جدید عہدہ پر سرفراز ہو کر کچھ دنون کے بعد یمن چلے گئے، اور ۹۷۴ھ مین یمن ہی مین وفات پائی،

(۴) "ان کا امام جو ملا یا داعی کہا جاتا ہے، سورت مین اقامت گزین ہے"، اس جملہ مین امام کا لفظ صحیح نہین ہے، بوہرون کے اعتقاد کے مطابق ان کا امام ستر مین ہے یعنی عام لوگون کی نظرون سے پوشیدہ ہے، ان کی تاریخ مین ہے کہ امام الآمر باحکام اللہ متوفی ۵۲۶ھ کے بعد الحافظ نے بجبر سلطنت پر قبضہ کر لیا، ورنہ آمر کا لڑکا ابو القاسم طیب اپنے باپ کا منصوص یعنی مقرر کردہ جانشین تھا، جیسا کہ سنہ ۵۲۵ھ اور سنہ ۵۲۶ھ کے ظاہری سکون سے ظاہر ہے، اور جب الحافظ نے امام طیب کو قتل کر ڈالنا چاہا، تو وہ ستر مین آگئے، یعنی مخفی اپنی زندگی بسر کرنے لگے، اور آج تک ان کی نسل یکے بعد دیگرے مخفی رہ کر امامت کا فرض ادا کرتی رہتی ہے، جب ظہور کا وقت آئے گا تو اس وقت جو شخص بر سر امامت ہوگا، وہ ظاہر ہو جائے گا، اور امام کی غیبت مین ان کا کام داعی کرتا ہے، داعیون کے متعدد درجے تھے، جس کا آخری عہدہ "داعی الدعاۃ" کہلاتا تھا، تاریخون مین مذکور ہے کہ ان داعیون سے امام کبھی کبھی مخفی طور پر ملاقات کر کے ہدایات دیتے تھے، اور یہ سلسلہ (ان کے عقیدہ کے مطابق) خواب مین تو اب بھی جاری ہے، غالباً سیدنا ادریس یمنی آخری داعی ہین، جن سے امام مستور کی ملاقات ہوئی، اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا،

سیدنا شمس الدعاۃ طاہر سیف الدین صاحب نے بمبئی کے ایک مشہور مقدمہ مین جو بیان عدالت مین دیا ہے اس مین اپنے کو داعی مطلق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور وکیل کے جرح پر داعی مطلق کی تشریح "کالامام" (یعنی مثل امام کے) کے لفظ فرمایا ہے، اس سے واضح ہو گیا، کہ اختیارات تو امام ہی کے مثل ہین، گویا خود امام حکم دے رہا ہے، مگر کہتے اپنے کو داعی مطلق ہی ہین، اور اسی لئے داعی اپنی تحریر مین دستخط کے وقت اپنی نسبت "مملوک آل محمد" کا لفظ استعمال کرتا ہے،

(۵) بوہرون کی ایک جماعت جعفری بھی کہلاتی ہے، جو مظفر شاہ کے عہد مین سُنّی ہو گئی، یہ لوگ سید احمد جعفری شیرازی کی طرف منسوب ہین جنھون نے شیعہ سے سُنّی بنایا،

یہ بیان بالکل خلاف واقعہ ہے، سید احمد جعفر شیرازی کی وفات ۹۴۴ھ بعہد بہادر شاہ گجراتی ہوئی ہے[1]، وہ ہمایون اور شیر شاہ کے ہم عصر ہین، در اصل دو نامون مین لوگون کو اشتباہ ہو گیا، بوہرون کو جس نے سُنّی بنایا ان کا نام بھی جعفر تھا لیکن وہ شیرازی نہ تھے، بلکہ پٹنی تھے، البتہ جعفر شیرازی اور محمد بن طاہر پٹنی محدث نے احمد آباد اور پٹن مین، یہ کام انجام دیا، کہ سُنّی اور شیعہ مین باوجود اختلاف مذہب کے معاشرتی تعلقات وازدواج قائم تھا، ان دونون عالمون نے ترک موالات کا پر اثر وعظ کہکر قطع تعلقات کرا دیا، جو آج تک قائم ہے،

فرقہ جعفریہ کے بانی "ملا جعفر" پٹن (گجرات) مین پیدا ہوئے، اور اسی جگہ ابتدائی تعلیم حاصل کی، متوسط تعلیم احمد آباد کے مدرسہ مین ختم کر کے یمن چلے گئے، جہان سید شمس الدین علی داعی وقت تھے، چند سال کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے، مگر چونکہ والی ہند ملا حسن بن آدم کی اجازت کے بغیر گئے تھے، اس لئے سیدنا علی یمنی داعی وقت نے ان کو تعلیمی سند نہ عطا کی، اور نہ کوئی خطاب ہندوستان پہنچکر انھون نے بغیر اجازت نماز پڑھا دی، اس پر والی اور ملا جعفر مین خوب خوب گرما گرم بحث ہوئی، آخر ملا جعفر احمد آباد سے پٹن آئے، اور لوگون کو تشیع سے تسنن کی طرف دعوت دینی شروع کی، اور اس مین وہ بہت کامیاب رہے، یہ واقعہ تقریباً سنہ ۸۳۰ھ کا ہے جو احمد شاہ اول بانی احمد آباد کا عہد ہے، ملا جعفر نے گجرات کا دورہ کر کے اپنی تبلیغ کو بڑی وسعت دی، سنہ ۸۳۶ھ مین

[1] مرآۃ احمدی کا خاتمہ ص ۹۴ کلکتہ،

بعد محمد شاہ بن احمد شاہ وہ احمد آباد آئے، دربار میں ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی، عرصہ تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے، آخر شیعہ بوہروں نے چانپانیر آنے کی دعوت دی، جو ایک خود مختار راجہ کا پایۂ تخت تھا، جب جعفر صاحب وہاں پہنچے تو چند دنوں کے بعد شیعہ بوہروں نے بوسر بازار ۲۳ھ میں جعفر کو قتل کر دیا، اسی جگہ ان کا مزار ہے، اس کے بعد ان کا کوئی جانشین نہ ہوا، لیکن جعفری اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک ان سے مناظرہ اور مکالمہ کرتے رہے، آج کل جعفری اپنے کو جعفری نہیں کہتے، بلکہ سُنّی بوہرہ کہتے ہیں،

آج کل جو سُنّی بوہرے گجرات میں ہیں، ان میں بعد کے آنے والے تاجروں کے اختلاط کے سبب وہ ایک مخلوط قوم بن گئی ہے، چنانچہ طائف، مکہ، مدینہ، کوفہ اور عراق کے علاوہ بعض افغان بھی اس میں شامل ہو کر بوہرہ ہو گئے ہیں، چنانچہ ان کا الگ (افغانی لقب) اب تک پٹھان ہے، بعض عطار اور صوفیا بھی جو ایران کے راستہ (درۂ خیبر یا بولان) سے آئے، وہ بھی اس میں داخل ہو کر بوہرہ کہلاتے ہیں، غرض شہروں میں عموماً مخلوط نسل کے لوگ ہیں، لیکن گاؤں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں، جو نو مسلم ہیں، اور شیعہ سے سُنّی ہو گئے جیسے گانچی (تیلی) وغیرہ، میری کتاب تاریخ شیعہ بوہرہ مکمل ہو گئی ہے، اور اب اس کا گجراتی اور انگریزی ترجمہ بھی ہو رہا ہے، لیکن کاغذ کی نایابی نے طباعت سے مجبور کر رکھا ہے،

بالاپوری کاغذ

از

جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے، کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی برار

جولائی ۱۹۴۳ء کے معارف میں مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کا مضمون "ہندستان میں کاغذ کی تاریخ" دیکھا، اس میں انھوں نے بالاپوری کاغذ کا بھی ذکر کیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ معلوم نہیں کہ بالاپور، دولت آباد کے کسی محلہ کا نام تھا یا کسی دوسری جگہ کا نام تھا، ابھی اسی ماہ میں ضلع آکولہ (برار) کے قدیم شہر بالاپور میں میرا گذر ہوا، وہاں ایک محلہ "کاغذپورہ" اب تک موجود ہے، اور کاغذ بنانے کے حوض وغیرہ کے کھنڈر اب تک موجود ہیں، گو کہ وہاں اب کاغذ بنایا نہیں جاتا، لیکن دو شخص محمد ابراہیم اور محمد اعظم نامی جو کافی معمر ہیں، اس فن کو جانتے ہیں، اور انہی سے یہ روایت سُنی جاتی ہے، کہ کئی سو برس تک وہاں کاغذ بنتا رہا، اور اب ایک عرصے سے بننا موقوف ہے، چونکہ یہ بالاپور قدیم تاریخی شہر ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ مولانا سید ابو ظفر صاحب کے مضمون میں اسی شہر کے کاغذ سے مراد ہوگی،

وفیات

حضرت مولانا الیاس کاندھلوی

(المتوفی ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ)

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ قیامت تک امت محمدیہ میں سے ایک جماعت حق پر استوار اور قائم اور غالب قوت کے ساتھ دنیا میں موجود رہے گی، انشاء اللہ تعالیٰ اسلام کی تاریخ کا ہر پچھلا دور اس بشارت کی خبر کو دنیا میں سُناتا، اور اپنے عمل سے اسکی صداقت کو ظاہر کرتا رہے گا،

لوگ عموماً سلاطین اور بادشاہوں کو دین کا محافظ سمجھتے ہیں، اور ان کے فاتحانہ کارناموں سے خوش ہوتے ہیں لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ ظاہری حکومت کی یہ طاقت اگر کسی روحانی قوت کے شمول سے محروم ہو، تو اس ظاہری حکومت کا جاہ و جلال حق کی قوت کے بجائے باطل کی قوت کے فروغ کا سامان ہو جاتا ہے، تاریخ کا ہر صفحہ اس دعوی کے ثبوت کی تازہ دلیل ہے، لیکن باطن کی قوت ظاہری طاقت کی محتاج نہیں ہوتی، اسلام کا ظہور اسی شکل سے ہوا، اور ہندوستان میں اوس کی ترقی بھی کچھ اسی شان سے تقدیر الٰہی معلوم ہوتی ہے، اور اسی طریقہ سے اس کی ظاہری قوت کا فروغ بھی تقدیر الٰہی میں بظاہر مقصد نظر آتا ہے، واللہ اعلم بحقیقۃ الاحوال والمبتدء والمآل فی الماضی والاستقبال،

ہندوستان میں اسلام کی ظاہری طاقت دلی کی مغلیہ حکومت کے خاتمہ پر ختم ہو جاتی ہے، مگر عین اسی وقت اللہ تعالیٰ نے شاہانِ دہلی کا ایک اور سلسلہ کھڑا کر دیا، جن کے سپرد اس سرزمین میں اسلام کی حفاظت کا کاروبار کر دیا، اور جس کو وہ اس وقت سے آج تک برابر سلسلہ بہ سلسلہ اسی طرح انجام دیتے چلے آرہے ہیں، جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا چلا جاتا ہے اس سلسلہ کے مسند نشین بے تاج و کلاہ، فوج و لشکر کے بغیر اور زر و جواہر کے خزانوں سے بے نیاز اپنے دلق مرقع میں اور اپنی شکستہ حصیر و بوریا پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں،

ان شاہانِ دہلی کا مسکن گو دلی کا ایک ویرانہ تھا، جو اب ایسا ویرانہ ہے، کہ جہاں اس سلسلہ کا ایک فرد بھی سکونت پذیر نہیں، تاہم اوس کے وجود اور ظہور میں ہندوستان کے متعدد صوبے شریک ہیں، اجداد رہتک اور سونی پت میں متوطن ہو کر دہلی آئے، اور بادشاہ کا ملتان سے چلا اور بہار آیا، اور یہاں سے جونپور کو منتقل ہوا، پھر اودھ کے ایک قصبہ سدھور سے پیوند ہوا، پھر وقت کے عین تقاضے پر سمٹ کر دلی پہنچا، اور اطراف دلی کے ان قصبات سے آمیز ہوا، جو آج مظفرنگر، میرٹھ اور سہارنپور کے اضلاع میں واقع ہیں، جس کی صورت یہ ہوئی کہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں اُن کے ننھیالی مورث کو جو سدھور میں سکونت گزین تھے، بارہہ کے پاس جاگیر میں کچھ گاؤں ملے، اور اس تقریب سے وہ خاندان سدھور سے پھلت (ضلع مظفرنگر) کو منتقل ہو گیا، اور اس طرح تقدیر الٰہی کے نقاش نے دلی اور پھلت کے پیوند سے دلی کے ان شاہان فقر کے مرقع کو تیار کیا، اور اس تقریب سے ان بزرگوں

ل انفاس العارفین ص ۱۵۱، ۵۳، ۵۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۶۵، ۱۶۶

کے وم قدم ان اطراف کے قصبات سے وابستہ ہو کر ان کے لئے سعادت کا باعث بنے، اور ان بزرگوں کی آمد ورفت سے ان اطراف ودیار میں توفیق الٰہی اور علوم نبوی نے اس دور میں جلوہ گستری کی،

ممکن ہو کہ یہ میری وہمی خوش عقیدگی ہو لیکن کئی سال سے میرے دل میں یہ خیال بار بار آتا رہا، کہ ان بزرگوں کے انفاس قدسیہ، توجہات قلبیہ اور برکات سماویہ ہی کے اثرات ہیں، جو ان اطراف میں اس زمانہ اخیر میں اکابر امت، علمائے وقت، اور سالکین محققین انبوہ در انبوہ وجود پذیر ہوئے، اور جن کے بدولت اس تجدید ملت کے دورہ کو جس کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا جس کا اشارہ بار بار انھوں نے کیا ہے، اب تک بقا اور امتداد کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، چنانچہ ان حضرات کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک اُن اطراف کے قصبات ودیہات سے جس قدر علمائے کاملین اور صلحائے متقین پیدا ہوئے، اس دور میں ملک کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوئے، اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی تصدیق مشاہدہ سے صاف نظر آتی ہے، پھلت، بڈھانہ، کاندھلہ، کیرانہ، جھنجانہ، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون، انبیٹھ، رائے پور، منگلور، سہارنپور، دیوبند وغیرہ قصبوں سے اس دور میں جو مبارک اور مقدس ہستیاں عالم وجود میں آئیں، اور ان کے علمی وروحانی آثار وبرکات سے پورے ملک ہند کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں جو فیض پایا، کیا اوس سے کوئی انکار کر سکتا ہے،

کاندھلہ سہارنپور شاہدرہ (دہلی) لائٹ ریلوے لائن کے وسط میں دہلی کے رُخ پر یہ قصبہ واقع ہے، اس کی پُرانی آبادی کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے آج تک اس قصبہ کا ایک سلسلۂ فیض مسلسل نظر آتا ہے، حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شاہ صاحب ممدوح کے محبوب تلامذہ میں تھے، اور شمائل نبوی میں شیم الحبیب ان کا مشہور رسالہ ہے، اسی قصبہ کے دوسرے بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی ہیں، جو حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے، اور علم وفضل کے ساتھ زہد وتقویٰ میں یگانہ تھے، اسی خانوادہ کے انتساب اور اتصال سے وہ بزرگ ہستی عالم وجود میں آئی جس کے تذکرہ کی سعادت ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں،

خاندان وولادت مولانا ممدوح اسی قصبہ میں اور اسی خاندان میں پیدا ہوئے، جس کا سلسلۂ نسب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، تاریخی نام الیاس اختر تھا، جس سے ۱۳۰۳ھ کی تاریخ پیدائش ظاہر ہے، مولانا کی والدہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں، اور مولانا مظفر حسین صاحب مولانا محمود بخش کے صاحبزادہ اور حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے بھتیجے تھے، مولانا مظفر حسین صاحب بہت سیدھے سادے بزرگ تھے، زہد وورع اور اتباع سنت اور سادگی میں بے مثال تھے، گھروں میں اور مسجدوں میں وعظ فرماتے تھے، مستورات کو ان کے بیان سے بڑا فائدہ ہوتا تھا، ان کی ایک صاحبزادی بی بی امۃ الرحمان تھیں، جو اپنے باپ کی نمونہ تھیں، نہایت عابدہ وزاہدہ، یہاں تک کہ اکابر تک ان کے پاس حاضر ہونا اور اُن سے دعائیں لینا برکت کا باعث سمجھتے تھے، انہی بزرگ خاتون کی صاحبزادی بی بی صفیہ مولانا الیاس صاحب کی والدہ تھیں، یہ بھی بہت عبادتگذار اور ذاکرہ وشاغلہ تھیں، قرآن پاک کی حافظہ تھیں، اور روزانہ دیگر اوراد ووظائف کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت ایک منزل کرتی تھیں،

مولانا کے والد مولانا حافظ اسماعیل صاحب تھے، جو بڑے فرشتہ صفت بزرگ دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کے سمدھانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے، ۱۲۷۳ھ کے غدر کے بعد وہ بستی نظام الدین میں رہنے لگے، یہاں مرزا الٰہی بخش نے (جن کی بیٹی بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فخرو سے منسوب تھیں،) ایک مسجد بنوائی تھی، جس کو بنگلہ والی مسجد کہتے ہیں، مولانا اسماعیل صاحبؒ نے اپنی بقیہ عمر اسی مسجد میں بسر کی، اور وفات کے بعد اسی مسجد کے گوشۂ مشرق وجنوب میں مدفون ہوئے، اس آبادی کے اطراف میں جو مسلمان آباد ہیں، مولانا اسماعیل

کے فیض سے وہ مستفید ہوتے رہے،

مولانا اسماعیل صاحب نے دو شادیاں کیں، پہلی سے مولوی محمد صاحب اور دوسری سے مولانا محمد یحییٰ صاحب شاگرد وخاص حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور مولانا محمد الیاس صاحب ہوئے، اور ماشاء اللہ تینوں صاحبزادے عالم وفاضل اور صالح ومتقی، مولانا یحییٰ صاحب کے صاحبزادہ مولانا زکریا صاحب ہیں، جو بالفعل مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث اور متعدد کتابوں کے مصنف اور موطا امام مالک کے آخری شارح ہیں،

این خانہ تمام آفتاب است

تعلیم مولانا نے ابتدائی تعلیم اور فارسی وغیرہ وطن کے مکتب میں اور خاندان کے بڑوں سے حاصل کی، ابتدائی عربی تعلیم کے زمانہ میں ان کو درد سر کا ایک خاص قسم کا دورہ ہو جاتا تھا، جس سے مہینوں کا ناغہ ہو جاتا تھا، اس لئے مولانا کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب (تلمیذ خاص وخادم خاص مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ) ان کو اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے، اور ان کو ایک خاص نصاب کے ماتحت پڑھا کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دورۂ حدیث میں شرکت کی غرض سے دیوبند بھیجدیا، اوس سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہو کر مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور اُن سے اور وہاں کے دوسرے اساتذہ سے باقی فنون کی تکمیل کی، جس سے فارغ ہونے پر اسی مدرسہ میں مدرس کر دیئے گئے، متوسطات تک کی تعلیم اُن کے سپرد تھی،

بیعت واستفاضہ مولانا کے معاصروں اور دیکھنے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ وہ فطرۃً نہایت نیک، صالح اور متقی تھے، خود مولینا یحییٰ صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور بڑی محبت رکھتے تھے، دونوں بھائی ایک دوسرے کے جان نثار اور محب ومحبوب تھے، مولانا گنگوہیؒ طالب علمی میں کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، لیکن مولانا الیاس کو اونھوں نے اوسی زمانہ میں ان کی خواہش پر ان کو مرید کر لیا، مولانا گنگوہیؒ کی وفات کے بعد تکمیل علوم سے فارغ ہو کر مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے دست مبارک پر دوبارہ تجدید بیعت کی، اور تکمیل باطن میں مصروف ہوئے، اور یہاں تک ترقی کی کہ خلافت ارشاد سے مشرف ہوئے،

بستی نظام الدین جیسا کہ پہلے گذرا ہے کہ مولانا کے والد غدر کے بعد ہی سے بستی نظام الدین کی ایک مسجد میں مقیم ہو کر اطراف کے مسلمانوں کے رشد وہدایت میں مصروف رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادہ مولوی محمد صاحب ان کے جانشین ہوئے، یہ بھی بڑے بزرگ اور نیک اور صالح تھے، عبادت وزہد وتقویٰ کے ساتھ پوری زندگی بسر کی، اطراف کے مسلمانوں کو ان سے فائدہ پہنچا، اور اہل میوات میں بکثرت ان کے مرید ومعتقد تھے، اور دہلی کے مسلمان بھی اُن سے مستفید ہوئے، مرنے سے پہلے ۱۶ سال تک انکی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی، اور مرتے دم تک نماز باجماعت کے پابند رہے، عشاء کی نماز کے بعد وتر کے سجدہ میں انتقال فرمایا،

مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد یہ مسجد بالکل خالی رہی، مولانا کے دوسرے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کا اس سے پہلے ۱۳۳۴ھ میں انتقال ہو چکا تھا، اور مولانا الیاس صاحب ابھی اپنی تکمیل میں مصروف تھے، اس سے جب فراغت ہوئی تو دہلی کے مخلصین کے پیہم اصرار پر مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بیعت وتلقین کی اجازت دیکر دہلی بھیجدیا، اور مولانا نے اپنے بھائی کی جگہ بستی نظام الدین میں متوکلانہ اقامت شروع کی، ابتدا میں اُن کو بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا مگر اُن کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی، آخر اللہ تعالیٰ نے اُن کے کاموں میں برکت دی، اور اون کو مسلمانوں میں

حسن قبول عطا فرمایا،

سب سے پہلے اونھون نے اوس مکتب کو ترقی دی، جو وہان پہلے سے قائم تھا، اور اوس کو مدرسہ کی سطح پر لے آئے، شروعات ان میں عملی کے بجائے علمی رنگ گہرا تھا، یہی گہرائی اُن کے کامون مین بھی تھی، مدرسہ قائم کیا، تو ہر طالب علم کا یہ فرض قرار دیا کہ ہر نماز کے بعد ایک طالب علم کھڑا ہوکر نمازیون کے سامنے ایک مسئلہ بیان کردے، دوسرا ایک حدیث کا ترجمہ سنادے، تیسرا قرآن پاک کی کسی آیت کا ترجمہ اور مطلب بیان کردے، اس طرح نمازیون کا بڑا فائدہ ہونے لگا، اور اسی سے ان کی تبلیغی کوششون کا آغاز ہوا، یاد ہوگا کہ تحریک خلافت کے شباب میں ۱۹۲۳ء مین شردھانند جی کی کوشش سے آریہ تحریک نے زور پکڑا، اور خصوصیت کے ساتھ ملکانون اور میواتیون میں اپنا کام شروع کیا، میوات کا بڑا علاقہ ہے جو دہلی کے پاس سے لیکر راجپوتانہ کی ریاستون تک پھیلا ہوا ہے، خیال ہے کہ اس قوم کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے، ان کا پیشہ کاشتکاری اور مویشی پالنا ہے، لیکن یہ لوگ حد درجہ لڑاکے، اور چوری، ڈاکہ اور قتل مین بدنام تھے، کہنے کو مسلمان تھے، لیکن نام بھی مسلمانون کا نہین، اور کام بھی نہین، مولانا نے یہ سمجھ کر کہ یہ سارا فساد ان کی جہالت کے سبب سے ہے، میوات کے پورے علاقہ کا بڑی محنت سے دورہ فرمایا، میلون پیادہ پا چل کر، بیل گاڑی مین بیٹھکر، اور جہان سڑک تھی موٹر پر پورے علاقہ مین سالہا سال پھرتے رہے، جگہ جگہ مسجدون اور مکتبون کا انتظام کیا، ہر جگہ دخاک لوگون سے ملے، اُن کو اپنے سے آشنا کیا، اُن کو سمجھایا، ان کو دین بتلایا، کلمہ سکھلایا، جو جان چکے، اور سیکھ چکے اُن کو آگے بڑھایا، ان کو دوسرون کے بتانے اور سکھانے کا کام سپرد کیا، جو اہل نظر آئے، اُن کو ذکر و فکر کی تلقین کی، جو تعلیم کے قابل معلوم ہوئے ان کو تحصیل علم پر مامور کیا، اخلاص سے کام کرنے والون کو آس پاس سے بٹورا، اُن کو اپنے طرز دعوت سے آشنا کیا، اور اُن کو تھوڑی تھوڑی تعداد مین اس شرط کے ساتھ کہ وہ کھانے پینے اور سفر کا کل خرچ اپنی جیب سے کرین گے، گاؤن گاؤن مین بھیجا، اور اس طرح میوات کی پوری سرزمین مخلص مبلغ سپاہیون کا کیمپ بن گئی اور چند سال کے بعد ڈاکوؤن اور چورون کا جرائم پیشہ گروہ نیک صالح اور دیندار مسلمانون کی جماعت بن گئی، یہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کی وہ کرامت ہو جس کو پولیس کی سرکاری رپورٹ مین بھی صحیح مان لیا گیا، اور جرائم پیشہ گروہ سے وہ خارج قرار دیا گیا،

مولانا کا طریق دعوت بالکل سادہ تھا، خود سادہ تھے، سراپا اخلاص تھے، سراپا درد تھے، دین کے سچے غمخوار اور مسلمانون کے بدل خدمت گذار، اللہ پر متوکل، ایک دھن تھی کہ دن رات ان کو بیقرار رکھتی تھی، اُن کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، جو تھا وہ صرف دین کی خدمت، اور مسلمانون کی غمخواری اور اصلاح کی فکر تھی، یہی ان کی تقریر تھی، یہی ان کی گفتگو، اور اسی کا شب و روز ملنے جلنے والون سے اعلان و اظہار،

میری ملاقات مولانا کا ذکر خیر مدت سے سُن رہا تھا، ہمارے مدرسہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے متعدد اساتذۂ کرام جن کے سرخیل مولانا ابو الحسن علی ندوی تھے، کئی دفعہ بستی نظام الدین جاکر مولانا سے مل چکے تھے، اور بابرکت فیض سے مستفید ہو چکے تھے، بلکہ ہمارے یہان سے کئی سال سے متواتر طلبہ کے وفود مولانا کے حلقۂ مبلغین مین داخل ہوکر خدمت کیا کرتے تھے، اور واپس آکر اپنے تاثرات بیان کرتے تھے، مگر خاکسار کو ذاتی طور سے نیاز کا شرف حاصل نہ تھا اتفاق دیکھیے کہ گذشتہ سال مولانا ابو الحسن علی صاحب نے مولانا اور اون کے ساتھیون کو لکھنؤ اور ندوہ مین قیام کرنے کی دعوت دی، چنانچہ شعبان کی بیچ کی تاریخ اس کے لئے مقرر ہوئی، ادھر رجب کے شروع میں جولائی کی بیچ کی تاریخین تھین، خاکسار تھانہ بھون مین تھا کہ مولانا کی آمد کی اطلاع ملی اور تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا، کہ وہ واپس دہلی کیلئے اسٹیشن روانہ ہوگئے، مجھے بھی دہلی جانا تھا، اور اسی گاڑی سے مولانا ظفر احمد صاحب

کے ساتھ اسٹیشن آیا، دیکھا کہ ایک دبلے پتلے نحیف سے میانہ قد، بڑی داڑھی، کچھ کچھ پکی، ہاتھ مین چھڑی، سر پر عمامہ، مگر وہ کبھی سر سے اترا، اور کبھی سر پر رکھا ہوا، اسی طرح جسم پر بلے کرتے کے اوپر ایک عبا سا، مگر وہ بھی کبھی در بدو اور کبھی باہر ایک کمبل بچھائے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہین، ہم دونون بھی سلام کے بعد پاس جاکر بیٹھ گئے، وہ اور مولانا ظفر احمد صاحب تو مدت کے رفیق اور ایک دوسرے کے محب اور دوست تھے، مولانا نے فوراً اپنی تبلیغ کی تقریر شروع کردی، اور ان کو اپنے کام مین شرکت کی دعوت بڑے اصرار و الحاح سے فرماتے رہے، اور اپنے طریق دعوت کی توضیح بھی بیان فرماتے رہے، وہ مجھ سے بالکل ناآشنا تھے، اور مین اُن کے نام اور کام سے آشنا مگر خود اون کی حقیقت سے ناآشنا تھا، مین اُن کی باتون کو چپ سنتا رہا، آخر مین یہ عرض کی کہ حضرت! ایسے لوگون کو جو صرف دو چار دن آپ کی صحبت مین رہے، ان کو تزکیہ اور تصفیہ کے بغیر مبلغ بنا کر بھیجنا کیونکر مفید ہوگا، فرمایا مکتوبات مجدد الف ثانی پڑھیے، معلوم ہوجائے گا، دوبارہ عرض کی مین نے اُن کو پڑھا ہے، مگر اُن سے تو اس مشکل کا حل معلوم نہ ہوا، شاید مولانا کو کچھ اچنبھا ہوا، مولانا ظفر صاحب سے پوچھا آپ کون ہین، اونھون نے میرا نام لیا، تو خوشی سے اچھل پڑے، کھڑے ہوگئے، سینہ سے لگایا، اور مجبور کیا کہ اُنھی کے ساتھ اُنھی کے ڈبہ مین سکنڈ کلاس مین سفر کرون، میرا ٹکٹ بدلوایا، اور اوس وقت سے لیکر کاندھلہ تک برابر ڈیڑھ دو گھنٹہ بڑے جوش و خروش سے کلام فرماتے رہے، ان کی زبان مین لکنت تھی، تقریر پر قادر نہ تھے، تقریر بھی اٹکی ہوئی ہوتی تھی، مگر جوش و خروش کا سمندر ان موانع کے سارے خس و خاشاک کو بہائے لئے جاتا تھا، تھوڑی گفتگو کے بعد

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اوس نے کہا
مین نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل مین ہے

جسمانی کمزوری اور ضعف سینہ کے باوجود ان کے پھیپھڑے ان کی پرزور تقریر اور پرجوش گفتگو کے تسلسل اور تواتر کے سبب سے ہر وقت اس طرح ادھر ادھر کر اوٹھتے تھے، کہ مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ کہین یہ پھٹ نہ جائین، یا گلے کی رگین جو بار بار پھول جاتی تھین وہ نہ پھٹ جائین، یہ سب سہی مگر دریا اپنی روانی مین ہر خطرہ سے بے خبر اور ہر آفت سے بے پروا تھا،

مولانا نے اس اثنا مین جو کچھ فرمایا، مین نے اپنی استعداد کے مطابق اسکو پوری طرح سمجھ لیا، اتنے مین کاندھلہ آیا، اور وہ اتر گئے، مگر مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ کل رات کو دہلی مین پھاٹک حبش خان مین ان کا تبلیغی جلسہ ہے، مین اس مین شرکت کرون، چنانچہ شرکت بھی ہوا، اور تقریر بھی کی، اور مولانا نے اوس کی تصدیق و تصویب بھی فرمائی،

مین اس سفر سے لوٹ کر جب لکھنؤ آیا، تو مولانا کے اہل تبلیغ مجاہدون کی آمد لکھنؤ مین شروع ہوچکی تھی، اور ندوہ کی مسجد مین ان کا قیام تھا، اللہ اللہ کیا سادگی کی شان پائی، سادہ تکلف سے بری، شب زندہ دار، تہجد گذار، پچھلے پہر سے ذکر و فکر مین مصروف، صبح کی نماز پڑھکر اپنے کام کے لئے مستعد اور تیار،

ایک دو روز کے بعد مولانا مع اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ آئے، اور ندوہ کے مہمانخانہ مین ساتھ ہی قیام فرمایا، اور تقریباً ایک ہفتہ تک دن رات ساتھ رہا، ہر گفتگو مین شریک اور ہر مجلس میں رفیق، جیسے جیسے ملتا جاتا تھا، ان کی تاثیر بڑھتی جاتی تھی مولانا کی تقریر گو اٹکی ہوئی اور بیان ژولیدہ بدستور تھا، مگر مین نے دیکھا کہ جو آیا وہ اثر سے خالی نہ گیا،

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل مین
اثر یہ ہو نہین سکتا کبھی دعوائے باطل مین

لکھنؤ مین کئی جلسے ہوئے اور بار بار تقریرین ہوئین، لوگون نے مطلب سمجھا شرکت پر آمادہ ہوئے، کام کا آغاز ہوا تو

سے آئے ہوئے مبلغین لکھنؤ کے کوچہ کوچہ مین پھرے، اور مسلمانون کو کلمہ اور نماز کی تلقین کی، ایک ہفتہ کے بعد کانپور کی جانب کوچ ہوا، دو تین روز قیام رہا، خاکسار بھی ساتھ تھا، یہان بھی ہر وقت ان کی صحبت اوٹھائی، ان کی تقریرین سنین، ان کے کام کو جانچا بھی دھن کو دیکھا، ان کے دل سے جو لگی تھی، اس کے اٹھتے ہوئے شعلون کو خیال کی آنکھون سے دیکھا، ہر وقت مسلمانون کی اصلاح دین کی سربلندی، اور اعلاے کلمہ کے لئے درگاہ الٰہی مین دست نیاز دراز، آنکھین پرنم، آواز دلگیر،

زیادہ دیکھنے والون اور بار بار ملنے والون کو تو خدا جانے، ان کی کیا کیا ادائین پسند ہون گی، لیکن مجھے اس تھوڑی سی ملاقات میں انکی تین ادائین بہت پسند آئین، صبح کی نماز کے بعد مقتدیون کے رُخ بیٹھکر وہ کام کرنے والون کو دن کا کام سمجھاتے تھے اور بار بار ان کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائین فرماتے تھے، ان دعاؤن مین لفظ اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل کر دوسرون کے دلون کی گہرائی مین گھر کرلیتا تھا، ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد، مختلف اوقات مین ان کی زبان سے کسی قدر آواز مین یہ دعاے ماثور یاحیّ یاقیوم برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ ولاتکلنی الی نفسی طرفۃ عین (اے حیّ وقیوم خدا میں تری رحمت سے چاہتا ہون کہ تو میری فریاد کو سُنے، تو میری حالت کی درستی فرما دے، اور ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے میرے نفس پر نہ چھوڑے) نکلتی تھی، اور ان کے فقر وابتہال الی اللہ کی کیفیت کو ظاہر کرتی تھی، وہ اپنے ساتھیون کے ساتھ رہتے تھے، اور ان مین کسی قسم کا امتیاز نہین چاہتے تھے، لکھنؤ سے کانپور اپنے ہمراہیون کے ساتھ تھرڈ کلاس مین سوار تھے، ان کے بعض معتقد فرسٹ کلاس مین تھے، بھیڑ کا یہ عالم تھا، کہ تھرڈ مین تو ہلنا، بلکہ اپنی جگہ سے نکلنا بھی مشکل تھا، سکنڈ مین بیٹھنے کی جگہ تھی، مگر اندر جانے کی جگہ نہ تھی، فرسٹ مین گنجایش تھی، ہمرانشین پر کوشش کی گئی کہ مولانا نکل کر فرسٹ مین چلے آئین، مگر منظور نہین فرمایا، آخر کانپور کے قریب پہنچکر ظہر کی نماز یا اور کسی ضرورت کی بنا پر اس درجہ مین داخل ہوئے،

لکھنؤ کے قیام مین ایک دفعہ ایک دوست کے ہان عصر کے وقت چائے کی دعوت تھی، پاس کوئی مسجد نہ تھی، ان کی کوٹھی ہی مین نماز باجماعت کا سامان ہوا، خود کھڑے ہوکر اذان دی، اذان کے بعد مجھ سے ارشاد ہوا، کہ نماز پڑھاؤ، مین نے معذرت کی تو نماز پڑھائی، نماز کے بعد مقتدیون کی طرف رُخ کرکے فرمایا، بھائیو! مین ایک ابتلا مین گرفتار ہون، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نکالین، جب سے مین یہ دعوت لیکر کھڑا ہوا ہون لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے ہین، مجھے یہ خطرہ ہونے لگا ہے، مجھ مین اعجاب نفس نہ پیدا ہو جائے، مین بھی اپنے کو بزرگ نہ سمجھنے لگون، مین ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہون، کہ مجھے اس ابتلا سے سلامت نکال لین، آپ بھی میرے حق مین دعا فرمائین،

مجھے کبھی بستی نظام الدین جانے اور ان کی مسجد مین قیام کرنے کا اتفاق نہین ہوا، مگر جانے والون سے سُنا کہ پچھلے پہر رات کا سمان بڑا موثر ہوتا تھا، دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے، ہر طرف سے تہجد گزارون اور ذاکرون، اور تسبیح خوانون کی آوازین بلند ہوتی تھین، کوئی سجدہ مین ہوتا تھا تو کوئی رکوع مین، کوئی گریہ وبکا مین تھا، تو کوئی دعاؤن مین، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ سچائی کا ایک آفتاب کیونکر متعدد ذرون کو اپنے پاس کھینچ کر روشن بنا دیتا ہے،

مولانا کا جسمانی ضعف، پھر شب وروز کی یہ محنت، اور دعوت کے کامون مین ہمہ وقت کا یہ شدید انہماک اور آرام وراحت کی ہر تدبیر سے کامل اعراض نے ادھر ان کو ضعیف بنا دیا تھا، مہینون سے پیچش اور اسہال کا عارضہ پیدا کر دیا تھا اور ضعف روز بروز بڑھتا جاتا تھا، ہر علاج ناکام رہا، مگر اس حالت مین بھی کام کے انہماک اور دعوت کے جوش کا وہی عالم تھا، آخر مین یون تو نشست وبرخاست دشوار ہو گئی تھی، سہارے سے اٹھتے بیٹھتے تھے، مگر اس حالت میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام اخیر اخیر تک رہا!

بلکہ فرض نماز کھڑے ہوکر ادا فرماتے رہے، اور خدا جانے اس وقت ان کے اندر کہان سے طاقت آجاتی تھی،

اس زمانہ مین جو لوگ اُن سے ملنے اور اُن کو دیکھنے گئے، سبنے ان کی بڑی پرتاثیر کیفیتین بیان فرمائی ہین، برادر عزیز مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی کی تحریر اخبارون مین آچکی ہے، یہ اخیر وقت تک مولانا کے ساتھ تھے، دوسری تحریر مولانا ظفر احمد صاحب نے لکھکر بھیجی ہے، جو تبصرۃ للناس فی ترجمۃ الیاس کے نام سے الگ چھپے گی، . . . . اور اپنے اس مضمون مین بھی مین نے اس سے استفادہ کیا ہے، یہ بھی اخیر زمانہ مین مولانا سے ملے تھے، اور اوس زمانہ کے احوال وتاثرات قلم بند فرمائے ہین، اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانون کو نفع روزی فرمائے،

۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء) کو وفات پائی، اور اسی مقام بستی نظام الدین کی مسجد کے صحن کے باہر جنوبی ومشرقی گوشہ مین اپنے والد وبرادر معظم رح کے پہلو مین سپرد خاک ہوئے،

چپہ چپہ ہے وان گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہین ایسا خزانہ ہرگز

ذیل مین ہم تبرکاً اس خانوادہ کا پورا سلسلہ درج کرتے ہین،

شجرۂ نسب

مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ بن شیخ بہاء الدین شاہ بن مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ

از سلسلۂ اولاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مولوی محمد اشرف
|
مولوی محمد شریف

سلسلۂ پدری:
محمد فیض
|
مولوی محمد ساجد
|
حکیم غلام محی الدین
|
حکیم کریم بخش
— غلام حسین — غلام حسن
غلام حسین
|
مولانا محمد اسماعیل

سلسلۂ مادری:
عبد القادر
|
قطب الدین
|
شیخ الاسلام
— محمود بخش — مفتی الٰہی بخش
محمود بخش
|
مولانا مظفر حسین
|
بی امۃ الرحمٰن
مفتی الٰہی بخش
|
مولوی ابو الحسن
|
مولوی نور الحسن
|
محمد صادق

مولانا محمد اسماعیل — مولوی محمد (از زوجۂ دیگر)
بی بی صفیہ (زوجۂ اُخری مولانا اسماعیل)

مولانا محمد یحییٰ
|
مولانا زکریا

مولانا محمد الیاس
|
مولوی محمد یوسف

——— . ———

مطبوعات جدیدہ

سرگذشت حاتم مرتبہ جناب پروفیسر سید محی الدین صاحب قادری زور، حجم ۱۲۰ صفحے تقطیع ۲۲×۱۸ ناشر ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن

شاہ ظہور الدین حاتم دہلی کے وہ پہلے شاعر ہین جنھون نے سب سے پہلے مستقل طور پر اردو زبان مین شاعری کی، اور ان کی مشق سخن سے اردو شاعری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، انھون نے اپنی زندگی مین خود اپنا ایک سے زیادہ دیوان مرتب کیا، لیکن اس وقت تک بجز ایک مختصر انتخاب کلام کے جس کو مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا ہے، ان کا کوئی دیوان شائع نہین ہوسکا ہے جناب سید محی الدین قادری زور کو لندن مین ان کے دیوان کا ایک قابل قدر نسخہ "دیوان زادہ" کے نام سے ملا، اور اس کو موصوف نے ترتیب وتحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے لیکن ابھی اس کے شائع ہونے مین دیر ہے، اس لئے موصوف نے زیر نظر رسالہ کو جو دراصل اسی دیوان کا مقدمہ ہے "سرگذشت حاتم" کے نام سے شائع کر دینا مناسب سمجھا، اس مین نسخہ "دیوان زادہ" کی یہ اہمیت خاص طور پر دکھائی گئی ہے، کہ اس مین حاتم نے اپنے کلام کو تاریخ وار کیا ہے، اور انھین مشق سخن کے لئے طویل زمانہ ملا، اس لئے ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان درجہ بدرجہ کن ارتقائی منزلون سے گذری، اور لفظون ترکیبون اور محاورون مین کیا فرق ہوتا گیا، نیز مصنف نے اس دیوان اور دوسرے تذکرون کی مدد سے حاتم کی زندگی کے حالات مختلف بابون مین پیش کئے ہین، اور تذکرون کے اختلافی بیانون کو اپنے دلائل سے جانچا، اور پرکھا، اور کن بیانون کی تصحیح کی ہے، کہین تطبیق دی ہے، اردو زبان اور شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے لئے یہ حاتم کے سوانح حیات اور ان کے کلام کی خصوصیات پر جامع اور مستند رسالہ ہے، اور مطالعہ کے لائق ہے،

جرم وسزا، از باری صاحب ناشر اردو اکیڈمی لاہور، حجم ۱۱۸ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت ۱۲/

مصنف نے اس مین ایسے نامور یورپی اصحاب فکر وعمل کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہین، جنھون نے اپنے علمی عقلی، فکری اور سیاسی نظریے دنیا کے سامنے ظاہر کئے، اور یورپ کے حکمرانون اور مذہبی محکمۂ احتساب کے پادریون کی طرف سے مستوجب سزا قرار پائے باینہمہ وہ اپنے عقیدون پر استوار رہے، اور جس کو وہ اپنے زعم مین حق سمجھے اوس کی حمایت مین سزائین بھگتین، اور اپنی جانین نذر کین،

سنگ وخشت از جناب پروفیسر کنہیا لال کپور، حجم ۱۵۰ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت مجلد عار پتہ مکتبۂ جدید لاہور،

لاہور کے ادبی رسالون مین کسی گمنام ادیب کے طنزیہ مضامین وقتاً فوقتاً چھپتے تھے جن مین ادیبون شاعرون عام نوجوانون اور کبھی نئی شاعری کے نوجوان علمبردارون کی ذہنی، فکری، ادبی، اور شاعرانہ کمزوریون اور کبھی عام مجلسی ومعاشرتی خامیون کی نشاندہی خوش سلیقگی سے کیجاتی تھی، اب مضمون نگار نے اپنا آپ تعارف کرکے اپنے کو بے نقاب کیا، ہے اور ان مضامین کے مجموعہ کو شائع کرایا ہے، زمانہ کی تلاش غالب جدید شعرا کی ایک مجلس مین اور قومی لباس دلچسپ مضامین ہین امید ہے کہ یہ مجموعہ نوجوان ادیبون اور شاعرون کے لئے صلاح کار ثابت ہوگا،

حیدرآباد از جناب رضیہ سلطانہ حجم ۸۰ صفحے قیمت ۸/ ناشر ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

اس رسالہ مین بچون کے لئے حیدرآباد کے متعلق ضروری معلومات یکجا کئے گئے ہین،

"س"

جلد ۵۴ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۴ عیسوی عدد ۶

مضامین

شذرات

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیقات علمیہ کے تحت اکبر کے دین الٰہی پر ایک مقالہ ایک بنگالی طالب تحقیق نے لکھکر پیش کیا ہے جس مین ثابت کیا ہے کہ اکبر کا یہ مذہب آیات واحادیث کے مطابق، اور عین اسلام تھا، یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی سند کیلئے مستند سمجھا گیا، اور مقالہ نویس کو اسلامی علوم مین کمال مہارت کی داد دی گئی، اور کہتے ہین کہ اس کے مصنف کو یونیورسٹی کے محققین علوم اسلامیہ کی نگاہ مین اس لائق سمجھا گیا کہ اس کو مزید تعلیم کے لئے جامع ازہر مصر بھیجا جائے، اور وہان سے واپسی پر اوس کو اسلامی چیر پیش کی جائے،

یہ واقعہ اگر صحیح ہوتا، تو بہت امید افزا تھا، کیونکہ اس سے اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مذہبی علوم سے اس درجہ واقف ہو رہے ہین کہ ایک دوسرے کے اہم مذہبی مسائل مین ماہرانہ رائے دیسکتے ہین، مگر افسوس کہ واقعہ ایسا نہین، مصنف مذکور کا جامع ازہر تو کیا مدرسۂ عالیہ کلکتہ مین بھی داخلہ مشکل معلوم ہوتا ہے جسکو دنحو اور ادب مین تمیز نہو وہ مسائل دین اسلام مین تحقیق کی داد دینا چاہے، تو کیسے تعجب کی بات ہے،

مقالۂ مذکورنا واقفیتون کا مجموعہ، اور غلط قیاسات واستدلالات کی منطق سے معمور ہے، دبستان المذاہب جیسی مجہول الاسم مصنف کے بیان سے دین الٰہی کے جو اصول بتائے گئے ہین، وہ تمامتر فارسی عبارت کی نافہمی پر مبنی ہے، دین الٰہی کے اصول ورسوم کو ابو الفضل نے تفصیل سے لکھا ہے، ان رسوم کو سامنے رکھکر اوس کو دین کہنا دین سے ناواقفیت کا اظہار ہے،

بہرحال سنا ہے کہ بنگال کے علمی وتعلیمی حلقہ مین اس کو یہ سند قبول حاصل ہوئی، کہ مقالہ نویس صاحب کا نام یونیورسٹی مذکور مین اسلامی تاریخ کا جو نیا شعبہ قائم ہوا ہے، اوس کی صدارت کے لئے لیا جا رہا ہے، ہم کو علم نہین، کہ اس مقالہ کے ممتحنین مین کون کون اہل کمال شامل تھے، تاہم اتنا یقینی معلوم ہوتا ہے کہ علم کی خدمت پر تعلقات اور مصلحتون کو تقدم کا حق بخشا گیا ہے، علم کے دین الٰہی مین اس سے بڑا کفر کوئی دوسرا نہین ہوسکتا،

مصنف نے کتاب کے آغاز مین آل تیمور کے مذہبی حالات کا تیمور کے وقت سے لیکر اکبر تک جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے، کہ تیمور اور آل تیمور پورے مسلمان کبھی نہ تھے، بلکہ صوفیانہ ارتقا طے کرتے آئے تھے، جس کی آخری سیڑھی اکبر کا یہ دین الٰہی ہے، عمل کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ کوئی کامل مسلمان مشکل سے ثابت ہوسکتا ہے، مگر عقیدہ کے لحاظ سے آل تیمور کو ہمیشہ سے اسلئے بدعقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا